٥٩

الحَشْر

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

ا۔ سورہ کا عمود اور سابق سورہ سے تعلق

سابق سورہ —— المجادلۃ —— میں فرمایا ہے کہ جو لوگ اللہ اور اس کے رسول کی مخالفت کر رہے ہیں وہ بالآخر ذلیل و خوار ہو کے رہیں گے، غلبہ اللہ اور اس کے رسولوں کے لیے ہے، اس سورہ میں اسی دعوے کو بعض واقعات سے مبرہن فرمایا ہے جو اس دوران میں پیش آئے اور منافقوں کو آگاہ کیا ہے کہ اگر وہ آنکھیں رکھتے ہیں تو ان واقعات سے سبق لیں کہ جن دشمنوں کو وہ ناقابل تسخیر خیال کیے بیٹھے تھے اللہ تعالیٰ نے کس طرح ان کے دلوں میں رعب ڈال دیا کہ وہ خود اپنے ہاتھوں اپنے گھروں کو اجاڑ کر جلاوطنی کی زندگی اختیار کرنے پر مجبور ہوئے اور ان کے حامیوں میں سے کوئی ان کا ساتھ دینے والا نہ بنا۔

پوری سورہ میں خطاب منافقین ہی سے ہے۔ آخر میں یہ بات بھی ان پر واضح فرما دی گئی ہے کہ ان کے شبہات و شکوک دور کرنے اور ان کے دلوں کے اندر گداز پیدا کرنے کے لیے اس قرآن میں اللہ تعالیٰ نے وہ سب کچھ نازل کر دیا جو ضروری ہے۔ اگر یہ قرآن کسی پہاڑ پر بھی اتارا جاتا تو وہ بھی اللہ کی خشیت سے پاش پاش ہو جاتا۔ اگر یہ تمھارے دلوں پر اثر انداز نہیں ہو رہا ہے تو اس کے معنی یہ ہیں کہ تمھارے دل پتھروں سے بھی زیادہ سخت ہیں اور تم سزاوار ہو کہ اللہ تعالیٰ تمھارے ساتھ وہی معاملہ کرے جو تمھارے جیسے سنگ دلوں کے ساتھ وہ کیا کرتا ہے۔

ب۔ سورہ کے مطالب کا تجزیہ

(۱-۴) یہود بنی نضیر کی جلاوطنی کی طرف اشارہ۔ نقض عہد اور نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے قتل کی سازش کے جرم میں ان کو ان کے گھروں سے نکل جانے کا حکم دیا گیا۔ پہلے تو وہ اس کی تعمیل پر راضی ہو گئے لیکن بعد میں، اپنے بعض حلیفوں کی شہ مل جانے سے، وہ اکڑ گئے۔ بالآخر حضورؐ نے فوج کشی کی اور ان کو جلاوطن ہونے پر مجبور ہونا پڑا۔ ان کو یہ اجازت دی گئی کہ اپنے جو سامان وہ اونٹوں پر لے جا سکتے ہیں لے جائیں۔ چنانچہ جو کچھ وہ لے جا سکے لے گئے۔ بقیہ سامان پر مسلمانوں نے قبضہ کر لیا۔ یہ لوگ جلاوطن ہو کر خیبر چلے گئے۔ یہ واقعہ ۴ھ میں پیش آیا۔ منافقین کو اس واقعہ سے عبرت حاصل کرنے کی دعوت دی گئی ہے کہ تم سمجھتے تھے کہ ان کو نکالا نہیں جا سکتا حالانکہ یہ نکلے اور اس طرح نکلے کہ اپنے بنے بنائے گھروں کو انھوں نے خود اپنے ہاتھوں اجاڑا۔ اللہ کے رسول کے مخالفین کا یہی حشر ہوا کرتا ہے۔ مطلب یہ ہے کہ اگر تم نے ان کا سہارا لینے کی کوشش کی تو یہ اجڑے گھر کی دربانی ہو گی اور تمھارا

بھی وہی حشر ہوگا جو ان کا ہوا۔

(۱۰-۵) ایک جملہ معترضہ جس میں برسرِ موقع یہود اور منافقین کے بعض اعتراضات کا جواب دیا گیا ہے جو انھوں نے بنی نضیر کے باغوں کے اجاڑنے اور اموالِ فے کی تقسیم سے متعلق اٹھائے۔ نیز انصار اور مہاجرین کے اس سیر چشمانہ رویہ کی تحسین فرمائی گئی ہے جو منافقین کے برعکس انھوں نے اموالِ فے کے معاملے میں اختیار کیا۔

(۱۱-۱۷) منافقین کی ایک اور شرارت کی طرف اشارہ۔ انھوں نے بنی نضیر کے جلاوطن ہو جانے کے بعد بنو قریظہ کی پیٹھ ٹھونکنی شروع کر دی کہ ہم آپ لوگوں کے ساتھ ہیں۔ اگر بنی نضیر کی طرح آپ لوگ بھی نکالے گئے تو ہم بھی آپ کے ساتھ نکلیں گے اور اگر آپ پر حملہ ہوا تو ہم آپ کے ساتھ ہو کر لڑیں گے۔ قرآن نے آگاہ کیا کہ یہ محض زبان کے سورما ہیں۔ نہ نکلنے میں ساتھ دینے والے ہیں نہ لڑنے میں۔ یہ وہی کریں گے جو شیطان کیا کرتا ہے کہ مجرم کو جرم پر ابھارتا ہے اور جب وہ جرم کر بیٹھتا ہے تو وہ اس سے براءت کا اعلان کر کے الگ ہو جاتا ہے۔ اگر ان کی شہ پر بنو قریظہ بھی نقضِ عہد کر بیٹھے تو ان کا حشر بھی وہی ہوگا جو بنی نضیر کا ہو چکا ہے۔

(۱۸-۲۴) خاتمۂ سورہ —— جس میں مسلمانوں کو عام طور پر اور منافقین کو خاص طور پر تنبیہ ہے کہ ہر وقت آخرت کو یاد رکھو۔ ان لوگوں کی طرح نہ بن جاؤ جو خدا کو بھلا کر اپنے مقصدِ وجود اور اپنے انجام سے غافل ہو بیٹھے۔ دوزخ والوں اور جنت والوں میں بڑا فرق ہوگا۔ اس فرق کو کوئی معمولی فرق گمان کر کے اس کو نظر انداز نہ کرو۔ آسمان و زمین کی کامیابی صرف اہلِ جنت کا حصہ ہوگی۔ یہ بھی یاد رکھو کہ تم پر اتمامِ حجت کے معاملے میں کوئی کسر نہیں چھوڑی گئی ہے۔ یہ قرآن وہ چیز ہے کہ کسی پہاڑ پر بھی اتارا جاتا تو وہ خشیتِ الٰہی سے پاش پاش ہو جاتا۔ اگر تمھارے دل اس سے اثر پذیر نہیں ہو رہے ہیں تو یہ قرآن کا قصور نہیں بلکہ تمھارے دلوں کا قصور ہے کہ وہ پتھروں سے بھی سخت ہیں۔

آخر میں اسمائے الٰہی کا حوالہ تاکہ اہلِ ایمان میں ان کے ذکر سے کامل تفویض و تسلیم، ضعفاء میں عزم و توکل اور منافقین کے اندر خوف و خشیت پیدا ہو۔ پھر سورہ کا خاتمہ اسی آیت پر ہوا ہے جس سے اس کا آغاز ہوا۔

سُورَةُ الْحَشْرِ (۵۹)

مَدَنِيَّةٌ ——— آیات ۲۴

بِسۡمِ اللّٰهِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِيۡمِ

آیات ۱-۴

سَبَّحَ لِلّٰهِ مَا فِي السَّمٰوٰتِ وَمَا فِي الْاَرْضِ ۚ وَهُوَ الْعَزِيْزُ الْحَكِيْمُ ① هُوَ الَّذِيْٓ اَخْرَجَ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا مِنْ اَهْلِ الْكِتٰبِ مِنْ دِيَارِهِمْ لِاَوَّلِ الْحَشْرِ ؕ مَا ظَنَنْتُمْ اَنْ يَّخْرُجُوْا وَظَنُّوْٓا اَنَّهُمْ مَّانِعَتُهُمْ حُصُوْنُهُمْ مِّنَ اللّٰهِ فَاَتٰىهُمُ اللّٰهُ مِنْ حَيْثُ لَمْ يَحْتَسِبُوْا ۗ وَقَذَفَ فِيْ قُلُوْبِهِمُ الرُّعْبَ يُخْرِبُوْنَ بُيُوْتَهُمْ بِاَيْدِيْهِمْ وَاَيْدِي الْمُؤْمِنِيْنَ ۗ فَاعْتَبِرُوْا يٰٓاُولِي الْاَبْصَارِ ② وَلَوْلَآ اَنْ كَتَبَ اللّٰهُ عَلَيْهِمُ الْجَلَآءَ لَعَذَّبَهُمْ فِي الدُّنْيَا ۗ وَلَهُمْ فِي الْاٰخِرَةِ عَذَابُ النَّارِ ③ ذٰلِكَ بِاَنَّهُمْ شَآقُّوا اللّٰهَ وَرَسُوْلَهٗ ۚ وَمَنْ يُّشَآقِّ اللّٰهَ فَاِنَّ اللّٰهَ شَدِيْدُ الْعِقَابِ ④

بنی نضیر کی جلا وطنی

ترجمہ آیات ۱-۴

اللہ ہی کی تسبیح کرتی ہیں جو چیزیں آسمانوں اور زمین میں ہیں اور وہی غالب و حکیم ہے۔ وہی ہے جس نے نکالا ان لوگوں کو جنھوں نے اہل کتاب میں سے کفر کیا، ان کے گھروں سے حشر اول کے لیے۔ تمہارا گمان نہ تھا کہ وہ کبھی اپنے گھروں سے نکلیں گے اور ان کا گھمنڈ یہ تھا کہ ان کے قلعے ان کو اللہ کی پکڑ سے بچائے رکھیں گے تو اللہ کا قہر ان پر وہاں سے آدھمکا جہاں سے ان کو گمان بھی نہیں ہوا۔ اور اس نے ان کے

دلوں میں رعب ڈال دیا۔ وہ اپنے گھروں کو اجاڑ رہے تھے خود اپنے ہاتھوں سے بھی اور مسلمانوں کے ہاتھوں سے بھی۔ پس عبرت حاصل کرو اس سے اے آنکھیں رکھنے والو! ۱-۲

اور اگر اللہ نے ان کے لیے جلاوطنی نہ مقدر کر رکھی ہوتی تو ان کو دنیا میں عذاب دیتا اور ان کے لیے آخرت میں دوزخ کا عذاب ہے۔ یہ اس جرم میں کہ انھوں نے اللہ اور اس کے رسول کا مقابلہ کرنے کی کوشش کی، جو اللہ کا مقابلہ کرتے ہیں تو اللہ سخت پاداش والا ہے۔ ۳-۴

۱۔ الفاظ کی تحقیق اور آیات کی وضاحت

سَبَّحَ لِلّٰهِ مَا فِي السَّمٰوٰتِ وَمَا فِي الْاَرْضِ ۚ وَهُوَ الْعَزِيْزُ الْحَكِيْمُ (۱)

اس آیت کی اہمیت اور حکمت

یہ آیت سورۂ حدید کے شروع میں بھی گزر چکی ہے۔ وہاں اس کے مضمرات کی وضاحت ہو چکی ہے۔ یہاں خاص توجہ کی چیز یہ ہے کہ اس سورہ کا آغاز اور اختتام دونوں، نہایت معمولی فرق کے ساتھ، اسی آیت پر ہوا ہے جس سے یہ اشارہ نکلتا ہے کہ اس میں جو حقائق بیان ہوئے ہیں وہ اس آیت کے مضمرات کی تائید و تصدیق کرتے ہیں۔ گویا یہ سورہ اپنے اصل دعوے کو بھی ثابت کرتی ہے جو سابق سورہ میں بیان ہوا اور اللہ تعالیٰ کی ان صفات کی شہادت بھی فراہم کرتی ہے جو تمہید کی اس آیت میں بیان ہوئی ہیں۔

یہ آیت جس حقیقت کی یاد دہانی کرتی ہے وہ دراصل یہ ہے کہ یہ ساری کائنات اپنی تسبیح و تقدیس اور اپنی بندگی و سرافگندگی سے اس بات کی شہادت دیتی ہے کہ اس کا خالق ہر عیب، ہر کمزوری اور ہر شائبۂ شرک سے بالکل پاک و منزہ ہے۔ وہ ہر چیز پر قدرت و اختیار رکھتا ہے۔ اس کے کسی ارادے میں کوئی مزاحم نہیں ہو سکتا۔ اس کے ہر کام میں حکمت ہے۔ اس وجہ سے بندوں کے لیے صحیح رویہ یہ ہے کہ اپنے آپ کو اسی کے حوالہ کریں، اسی پر بھروسہ کریں، اسی کے احکام کی تعمیل کریں، اسی سے ڈریں اور اسی سے امید رکھیں۔ متصرف حقیقی وہی ہے۔ اس کے اذن کے بغیر کوئی چیز اپنی جگہ سے حرکت نہیں کر سکتی۔

اسی حقیقت کے ذہن میں راسخ ہونے سے صحیح ایمان پیدا ہوتا ہے جو تمام عزم و قوت کا سرچشمہ ہے اور اسی کے اندر رخنہ پیدا ہونے سے نفاق اور کفر و شرک کو دل کے اندر گھسنے کی راہ ملتی ہے جس سے علم و عمل کے ہر گوشے میں فساد پھیل جاتا ہے۔

هُوَ الَّذِيْٓ اَخْرَجَ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا مِنْ اَهْلِ الْكِتٰبِ مِنْ دِيَارِهِمْ لِاَوَّلِ الْحَشْرِ ؔ مَا ظَنَنْتُمْ اَنْ يَّخْرُجُوْا وَظَنُّوْٓا اَنَّهُمْ مَّانِعَتُهُمْ حُصُوْنُهُمْ مِّنَ اللّٰهِ فَاَتٰىهُمُ اللّٰهُ مِنْ حَيْثُ لَمْ يَحْتَسِبُوْا ۤ وَقَذَفَ فِيْ قُلُوْبِهِمُ الرُّعْبَ يُخْرِبُوْنَ بُيُوْتَهُمْ بِاَيْدِيْهِمْ وَاَيْدِي الْمُؤْمِنِيْنَ ۤ فَاعْتَبِرُوْا يٰٓاُولِي الْاَبْصَارِ (۲)

بنی نضیر کی غداری اور ان کا حشر

"اَلَّذِيْنَ كَفَرُوْا مِنْ اَهْلِ الْكِتٰبِ" سے مراد مفسرین کے نزدیک یہود بنی نضیر ہیں جو مدینہ منورہ کے قریب آباد تھے۔ بخاریؒ کے بیان کے مطابق مختصراً ان کا واقعہ یہ ہے کہ انھوں نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ اگرچہ صلح و امن کا معاہدہ کر رکھا تھا لیکن بدر کے چھٹے مہینہ معاہدے کے خلاف انھوں نے اسلام کے دشمنوں سے ساز باز بھی کی اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے قتل کی ایک ناکام سازش کے بھی مرتکب ہوئے۔ ان کے اس جرم کی پاداش میں آپ نے ان کو مدینہ سے نکل جانے کا حکم دیا۔ پہلے تو وہ اس حکم کی تعمیل پر آمادہ ہو گئے لیکن بعد میں مشہور منافق عبداللہ بن اُبی نے انھیں اکسایا کہ میرے دو ہزار آدمی تمھارے ساتھ ہیں نیز قریش اور غطفان بھی تمھاری حمایت کریں گے، تم نکلنے سے انکار کر دو۔ عبداللہ بن ابی کی ان باتوں سے وہ اس کے چکمہ میں آگئے اور نکلنے سے انکار کر دیا۔ بالآخر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ان پر فوج کشی کی۔ اس وقت نہ بنو قریظہ نے ان کا ساتھ دیا نہ قریش اور غطفان نے۔ ناچار انھیں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے حکم کی تعمیل کرنی پڑی۔ آپ نے ازراہِ عنایت یہ اجازت انھیں دے دی کہ جتنا سامان وہ اونٹوں پر لے جا سکتے ہیں اتنا لے جائیں۔ چنانچہ وہ جتنا سامان لے جا سکے لے کر خیبر اور اذرعات چلے گئے۔ ان کی باقی املاک و جائداد پر آپ نے قبضہ کر لیا۔

"لِاَوَّلِ الْحَشْرِ"۔ یعنی ان کا یہ اخراج پہلے حشر کے طور پر ہوا۔ اس کے اندر یہ تنبیہ ہے کہ اس کے بعد بھی انھیں اسی طرح کے حشر سے دوچار ہونا پڑے گا۔ چنانچہ حضرت عمرؓ کے عہد میں انھیں وہاں سے بھی نکلنا پڑا اور سب سے بڑا حشر ——— قیامت کا حشر ——— آگے آنے والا ہے۔

منافقوں سے خطاب

"مَا ظَنَنْتُمْ اَنْ يَّخْرُجُوْا وَظَنُّوْٓا اَنَّهُمْ مَّانِعَتُهُمْ حُصُوْنُهُمْ مِّنَ اللّٰهِ"۔ یہ خطاب انہی منافقین سے ہے جن کا ذکر پچھلی سورہ میں گزر چکا ہے۔ فرمایا کہ تم کو ان کی قوت و جمعیت اور ان کے حلیفوں کی حمایت و نصرت پر بڑا اعتماد تھا، تم سمجھے بیٹھے تھے کہ انھیں یہاں سے ہلایا نہیں جا سکے گا اور خود ان کو بھی اپنے قلعوں اور اپنی گڑھیوں پر بڑا ناز تھا کہ بھلا کسی کی مجال ہے کہ وہ

ان سے دُوبدو ہونے کی جرأت کر سکے لیکن دیکھ لو ان کا غرور کس طرح پامال ہوا۔

مغروروں کی ذہنیت

'مِنَ اللّٰهِ' میں عربیت کے قاعدے کے مطابق مضاف محذوف ہے یعنی 'مِنْ بَأْسِ اللّٰهِ' یا 'مِنْ عَذَابِ اللّٰهِ' یا 'مِنْ بَطْشِ اللّٰهِ'۔ مطلب یہ ہے کہ انھوں نے قلعے اور گڑھیاں بنا لیں تو اس زعم میں مبتلا ہو گئے کہ وہ صرف انسانوں ہی سے نہیں بلکہ خدا کی پکڑ سے بھی مامون ہو گئے۔ یہ مغروروں کی ذہنیت کی بالکل صحیح تصویر ہے۔ جن کو اس دنیا میں قوت و شوکت حاصل ہو جاتی ہے وہ سمجھتے ہیں کہ بھلا ان کے قلعہ کے اندر کہاں سے کوئی رخنہ پیدا ہو سکتا ہے! یہاں تک کہ اگر اللہ کا کوئی بندہ ان کو خدا کی پکڑ سے بھی ڈرائے تو بھی ان کی سمجھ میں یہ بات نہیں آتی کہ ان کے اس محفوظ حصار کے اندر خدا کدھر سے آ جائے گا!

خدا کا حملہ بے امان ہے

'فَاَتٰىهُمُ اللّٰهُ مِنْ حَيْثُ لَمْ يَحْتَسِبُوْا' یعنی انھوں نے تو اپنی دانست میں اپنے قلعوں کے اندر خدا کے در آنے کے لیے بھی کوئی جگہ نہیں چھوڑی تھی لیکن خدا وہاں سے ان پر آ دھمکا جہاں سے ان کو سان گمان بھی نہ تھا۔

'وَقَذَفَ فِيْ قُلُوْبِهِمُ الرُّعْبَ'۔ یہ نشان دہی فرمائی ہے کہ خدا نے کدھر سے ان پر تاخت کی۔ فرمایا کہ وہ اپنے اردگرد اینٹوں اور پتھروں کی دیواریں چن کر سمجھے کہ خدا کی پکڑ سے باہر ہو گئے لیکن اللہ نے ان کی دیواریں ہٹانے کی بھی ضرورت نہیں سمجھی بلکہ براہ راست ان کے دلوں میں رعب ڈال دیا جس کا اثر یہ ہوا کہ وہ قلعے اور گڑھیاں رکھتے ہوئے ایسے مرعوب ہوئے کہ اپنے بنائے ہوئے گھروں کو انھوں نے خود اپنے ہاتھوں اجاڑا۔ یہ امر یہاں ملحوظ رہے کہ اصل طاقت اسلحہ اور قلعوں کی دیواروں کے اندر نہیں بلکہ دلوں کے اندر ہوتی ہے جو اللہ پر ایمان سے پیدا ہوتی ہے۔ اگر یہ طاقت موجود ہو تو فی الواقع بے تیغ بھی سپاہی لڑتا ہے اور اگر یہ نہ ہو تو ایٹمی آلات کی بڑی سے بڑی مقدار بھی بے سود ہے بلکہ اندیشہ اس بات کا بھی ہے کہ یہ چیزیں دشمن کے بجائے خود اپنی ہی تباہی کا ذریعہ بن جائیں۔

'يُخْرِبُوْنَ بُيُوْتَهُمْ بِاَيْدِيْهِمْ وَاَيْدِي الْمُؤْمِنِيْنَ'۔ یہ ان کی مرعوبیت کی تصویر ہے کہ اپنے جو مکانات انھوں نے نہ جانے کتنے ولولوں اور ارمانوں سے بنائے تھے خود اپنے ہاتھوں سے اجاڑ رہے تھے۔ 'يُخْرِبُوْنَ' یہاں تصویر حال کے لیے ہے۔ اوپر ہم اشارہ کر چکے ہیں کہ ان کو یہ اجازت دے دی گئی تھی کہ اپنے اونٹوں پر جتنا سامان لے جا سکتے ہیں اتنا لے جائیں۔ اس اجازت سے فائدہ اٹھا کر انھوں نے مکانوں کی شہتیریں، کڑیاں، دروازے اور کھڑکیاں بھی اکھاڑ کر اپنے اونٹوں پر لاد لینے کی کوشش کی۔ حرصِ مال کے علاوہ مسلمان دشمنی کا جذبہ بھی کارفرما تھا اس وجہ سے انھوں نے یہ کوشش بھی کی ہو گی کہ جو چیز بچ بھی رہے اس کو بھی اس طرح ناکارہ بنا دیں کہ مسلمان اس

سے کوئی فائدہ نہ اٹھا سکیں۔

'وَاَیْدِی الْمُؤْمِنِیْنَ': ان کی اس تخریب میں مسلمانوں نے بھی ہاتھ بٹایا ہوگا کہ یہ مفسدین جس قدر جلد ممکن ہو ان کے قرب سے دفع ہوں۔ علاوہ ازیں آگے کی آیات سے معلوم ہوتا ہے کہ ان کے بعض باغ مسلمانوں نے جنگی ضرورت کے لیے بھی کاٹے۔

'فَاعْتَبِرُوْا یٰۤاُولِی الْاَبْصَارِ': یہ اس واقعہ سے ان تمام لوگوں کو عبرت حاصل کرنے کی دعوت دی گئی ہے جن کے اندر عبرت پذیری کی صلاحیت ہے کہ دیکھ لو قرآن کی ہر بات کس طرح سچی ثابت ہوئی۔ اللہ و رسول کی مخالفت کرنے والوں کو کس طرح ذلت سے دوچار ہونا پڑا۔ حزب اللہ کے مقابل میں حزب الشیطان کو کس طرح شکست ہوئی۔ اگر اس کے بعد بھی کچھ لوگ اللہ و رسول کے دشمنوں سے دوستی رکھنے کے خواہش مند ہیں تو کر کے دیکھ لیں کہ اس کا انجام کیا ہوتا ہے۔

وَلَوْلَاۤ اَنْ کَتَبَ اللّٰهُ عَلَیْهِمُ الْجَلَآءَ لَعَذَّبَهُمْ فِی الدُّنْیَا ؕ وَلَهُمْ فِی الْاٰخِرَةِ عَذَابُ النَّارِ (۳)

یعنی یہ تو اللہ نے ان کے ساتھ رعایت فرمائی کہ ان کو جلا وطنی ہی کی سزا دی۔ اس کی حکمت کا تقاضا یہی ہوا کہ اسی تنبیہ پر کفایت کی جائے کہ ان کے اندر عبرت پذیری کی کچھ صلاحیت ہو تو وہ اپنے رویہ کی اصلاح کریں۔ اگر یہ بات نہ ہوتی تو اللہ تعالیٰ اس دنیا ہی میں ان پر اس طرح کا کوئی فیصلہ کن عذاب بھیج دیتا جس طرح کے عذاب عاد و ثمود اور فرعون وغیرہ پر آئے جن سے ان کا قصہ ہی پاک ہو گیا۔

'وَلَهُمْ فِی الْاٰخِرَةِ عَذَابُ النَّارِ': یعنی اس سے انھوں نے فائدہ نہ اٹھایا تو معاملہ اس جلا وطنی ہی پر ختم نہیں ہو جائے گا بلکہ آخرت میں ان کے لیے دوزخ کا عذاب بھی ہے جو ساری کسر پوری کر دے گا۔

ذٰلِكَ بِاَنَّهُمْ شَآقُّوا اللّٰهَ وَرَسُوْلَهٗ ۚ وَمَنْ یُّشَآقِّ اللّٰهَ فَاِنَّ اللّٰهَ شَدِیْدُ الْعِقَابِ (۴)

یعنی یہ غضب ان پر اس وجہ سے ہوا کہ انھوں نے اللہ اور اس کے رسول کی مخالفت کی اور سنتِ الٰہی یہی ہے کہ جو اللہ کی مخالفت کرتے ہیں وہ اس کی شدید پاداش سے دوچار ہوتے ہیں۔

اس آیت میں یہ نکتہ قابلِ توجہ ہے کہ 'وَمَنْ یُّشَآقِّ اللّٰهَ' میں 'وَرَسُوْلَهٗ' کو حذف کر دیا ہے جس سے یہ بات نکلتی ہے کہ رسول سے مخاصمت درحقیقت اللہ سے مخاصمت ہے اور جو اللہ سے مخاصمت کے لیے اٹھتا ہے وہ اچھی طرح سوچ لے کہ اس کا کیا انجام ہو سکتا ہے!

۲- آگے آیات ۵-۱۰ کا مضمون

آگے اصل سلسلۂ مضمون سے ذرا ہٹ کر، بطور جملۂ معترضہ، یہود اور منافقین کے بعض اعتراضات و شبہات کے جواب دیے ہیں جو اسی واقعۂ بنی نضیر کے تعلق سے پیدا ہوئے۔

ایک اعتراض تو یہود نے اٹھایا کہ مسلمانوں نے ان کے باغوں کے بہت سے بار آور درخت کاٹ دیے۔ یہ درخت اگرچہ جنگی مصلحت سے کاٹے گئے تھے لیکن یہود اور ان کے ہمدردوں نے اس کو یہ رنگ دینے کی کوشش کی کہ یہ افساد فی الارض ہے درآنحالیکہ مسلمان اصلاح فی الارض کے مدعی ہیں۔ اس اعتراض سے ان کا مقصود یہ تھا کہ اسلام کی دعوت کو لوگوں کی نگاہوں میں مشکوک بنائیں کہ یہ دین کی دعوت نہیں بلکہ حصولِ اقتدار کی کشمکش ہے، جس میں دین کا نام محض لوگوں کو، العیاذ باللہ، دھوکا دینے کے لیے لیا جا رہا ہے۔ اس نوعیت کے ایک اعتراض کا جواب سورۂ حدید میں بھی گزر چکا ہے جو اہل کتاب ہی کا اٹھایا ہوا تھا۔

دوسرا سوال منافقین نے بنی نضیر کے متروکہ اموال و املاک سے متعلق اٹھایا کہ ان کو بھی اموالِ غنیمت کی طرح، پانچواں حصہ الگ کر کے، باقی فوجیوں میں تقسیم کیا جانا چاہیے لیکن قرآن نے اس کو مالِ غنیمت کے بجائے مالِ فَے کی حیثیت دی اور اس کے متعلق یہ حکم دیا کہ یہ سب کا سب سرکاری خزانے میں جمع ہو گا تاکہ اس سے غربا و مساکین اور خاص طور پر ان مہاجرین کی مدد کی جائے جو صرف دین کی خاطر اپنے گھروں سے نکالے اور اپنی جائیدادوں سے محروم کیے گئے ہیں۔ اسی ذیل میں انصار اور مہاجرینِ اوّلین کے ایثار اور ان کی سیر چشمی کی تحسین فرمائی کہ وہ اپنے مہاجر بھائیوں کے لیے نہایت فراخ دل ہیں اور اپنی ضرورت پر ان کی ضرورت کو ترجیح دیتے ہیں۔ یہی رویہ اہلِ ایمان کے شایانِ شان ہے۔ اس روشنی میں آیات کی تلاوت فرمائیے۔

آیات ۵-۱۰

مَا قَطَعۡتُمۡ مِّنۡ لِّيۡنَةٍ اَوۡ تَرَكۡتُمُوۡهَا قَآئِمَةً عَلٰٓى اُصُوۡلِهَا فَبِاِذۡنِ اللّٰهِ وَلِيُخۡزِىَ الۡفٰسِقِيۡنَ ﴿۵﴾ وَمَآ اَفَآءَ اللّٰهُ عَلٰى رَسُوۡلِهٖ مِنۡهُمۡ فَمَآ اَوۡجَفۡتُمۡ عَلَيۡهِ مِنۡ خَيۡلٍ وَّلَا رِكَابٍ وَّلٰـكِنَّ اللّٰهَ يُسَلِّطُ رُسُلَهٗ عَلٰى مَنۡ يَّشَآءُ ؕ وَاللّٰهُ عَلٰى كُلِّ شَىۡءٍ قَدِيۡرٌ ﴿۶﴾ مَآ اَفَآءَ اللّٰهُ عَلٰى رَسُوۡلِهٖ مِنۡ اَهۡلِ الۡقُرٰى فَلِلّٰهِ وَلِلرَّسُوۡلِ وَ

لِذِی الْقُرْبٰی وَالْیَتٰمٰی وَالْمَسٰکِیْنِ وَابْنِ السَّبِیْلِ کَیْ لَا یَکُوْنَ
دُوْلَۃً بَیْنَ الْاَغْنِیَآءِ مِنْکُمْ ؕ وَمَآ اٰتٰکُمُ الرَّسُوْلُ
فَخُذُوْہُ ۚ وَمَا نَھٰکُمْ عَنْہُ فَانْتَھُوْا ۚ وَاتَّقُوا اللّٰہَ ؕ اِنَّ اللّٰہَ
شَدِیْدُ الْعِقَابِ ۷ لِلْفُقَرَآءِ الْمُھٰجِرِیْنَ الَّذِیْنَ اُخْرِجُوْا
مِنْ دِیَارِھِمْ وَاَمْوَالِھِمْ یَبْتَغُوْنَ فَضْلًا مِّنَ اللّٰہِ وَرِضْوَانًا
وَّیَنْصُرُوْنَ اللّٰہَ وَرَسُوْلَہٗ ؕ اُولٰٓئِکَ ھُمُ الصّٰدِقُوْنَ ۸
وَالَّذِیْنَ تَبَوَّؤُ الدَّارَ وَالْاِیْمَانَ مِنْ قَبْلِھِمْ یُحِبُّوْنَ مَنْ
ھَاجَرَ اِلَیْھِمْ وَلَا یَجِدُوْنَ فِیْ صُدُوْرِھِمْ حَاجَۃً مِّمَّآ اُوْتُوْا
وَیُؤْثِرُوْنَ عَلٰٓی اَنْفُسِھِمْ وَلَوْ کَانَ بِھِمْ خَصَاصَۃٌ ؕ۟ وَمَنْ
یُّوْقَ شُحَّ نَفْسِہٖ فَاُولٰٓئِکَ ھُمُ الْمُفْلِحُوْنَ ۹ وَالَّذِیْنَ
جَآءُوْ مِنْۢ بَعْدِھِمْ یَقُوْلُوْنَ رَبَّنَا اغْفِرْ لَنَا وَلِاِخْوَانِنَا
الَّذِیْنَ سَبَقُوْنَا بِالْاِیْمَانِ وَلَا تَجْعَلْ فِیْ قُلُوْبِنَا غِلًّا
لِّلَّذِیْنَ اٰمَنُوْا رَبَّنَآ اِنَّکَ رَءُوْفٌ رَّحِیْمٌ ۱۰

ع

ترجمہ آیات ٥-١٠

کھجوروں کے جو درخت تم نے کاٹ ڈالے یا جو سلامت چھوڑ دیے تو یہ اللہ کے حکم سے ہوا اور تاکہ وہ نافرمانوں کو رسوا کرے۔ ٥

اور اللہ نے ان کی طرف سے جو کچھ اپنے رسول کی طرف لوٹایا تو تم نے اس پر نہ اپنے گھوڑے دوڑائے نہ اونٹ بلکہ اللہ ہے جو اپنے رسولوں کو مسلّط کر دیتا ہے جس پر چاہتا ہے، اور اللہ ہر چیز پر قادر ہے۔ جو کچھ اللہ بستیوں والوں کی طرف سے

اپنے رسول کی طرف لوٹائے تو وہ اللہ اور رسول اور قرابت مندوں اور یتیموں اور مسکینوں اور مسافروں کے لیے ہے۔ تاکہ اس کی گردش تمھارے مال داروں ہی کے اندر محدود ہو کر نہ رہ جائے۔ اور رسول جو تمھیں دے اس کو لو اور جس سے روکے اس سے رک جاؤ اور اللہ سے ڈرتے رہو بے شک اللہ سخت پاداش والا ہے۔ یہ خاص طور پر ان محتاج مہاجرین کے لیے ہے جو اپنے گھروں اور اپنی املاک سے نکالے گئے ہیں اللہ کے فضل اور اس کی خوشنودی کی طلب اور اللہ اور اس کے رسول کی مدد کرتے ہوئے یہی لوگ اصل راستباز ہیں۔ ۶-۸

اور جو لوگ پہلے سے ٹھکانے بنائے ہوئے اور ایمان استوار کیے ہوئے ہیں وہ دوست رکھتے ہیں ان لوگوں کو جو ہجرت کر کے ان کی طرف آرہے ہیں اور جو کچھ ان کو دیا جا رہا ہے اس سے وہ اپنے دلوں میں کوئی خلش نہیں محسوس کر رہے ہیں اور وہ ان کو اپنے اوپر ترجیح دے رہے ہیں اگرچہ انھیں خود احتیاج ہو۔ اور جو خود غرضی سے محفوظ رکھے گئے تو درحقیقت وہی لوگ فلاح پانے والے ہیں۔ ۹

اور جو ان کے بعد آئے وہ دعا کرتے ہیں کہ اے ہمارے رب! ہم کو بھی بخش اور ہمارے ان بھائیوں کو بھی بخش جنھوں نے ایمان لانے میں ہم پر سبقت کی اور ہمارے دلوں میں اہل ایمان کے لیے کینہ نہ پیدا ہونے دے۔ اے ہمارے رب بے شک تو نہایت شفیق و مہربان ہے! ۱۰

۳- الفاظ کی تحقیق اور آیات کی وضاحت

مَا قَطَعْتُمْ مِّنْ لِّيْنَةٍ اَوْ تَرَكْتُمُوْهَا قَآئِمَةً عَلٰٓى اُصُوْلِهَا فَبِاِذْنِ اللّٰهِ وَلِيُخْزِيَ الْفٰسِقِيْنَ (۵)

'لِيْنَة' کھجور کے مثمر درخت کو کہتے ہیں۔ یہ یہود اور ان کے حلیفوں کے ایک اعتراض کا برمحل جواب ہے۔ مسلمانوں نے جب بنی نضیر پر فوج کشی کی تو جنگی ضرورت و مصلحت کے تحت ان کے باغوں کے کچھ درخت انھیں کاٹنے پڑے۔ اس چیز کو انھوں نے اسلام کے خلاف پروپیگنڈے کا ذریعہ بنا لیا کہ مسلمان دعویٰ تو کرتے ہیں کہ وہ ملک میں اصلاح کے لیے اٹھے ہیں لیکن ان کا حال یہ ہے کہ انھوں نے ہمارے باغوں کے پھل لانے والے عمدہ درخت کاٹ کے ڈال دیے۔ بھلا مثمر درختوں کا کاٹنا بھی کوئی اصلاح کا کام ہوا، یہ تو صریح اِفساد فی الارض ہے!

ایک اعتراض کا برمحل جواب

'اَوْ تَرَكْتُمُوْهَا قَآئِمَةً' کے بظاہر ذکر کی کوئی ضرورت معلوم نہیں ہوتی اس لیے کہ ان کو اعتراض درختوں کے کاٹنے پر تھا نہ کہ ان کے چھوڑنے پر لیکن اس کے ذکر سے ان کے اعتراض کے ایک خاص پہلو پر روشنی پڑتی ہے جس پر اس کے بغیر روشنی نہیں پڑ سکتی تھی۔ وہ یہ کہ جب انھوں نے یہ اعتراض اٹھایا ہو گا تو اس کو مؤثر بنانے کے لیے یہ بھی کہا ہو گا کہ اگر مسلمانوں کو صرف وقتی ضرورت کے لیے لکڑی مطلوب تھی تو وہ فلاں اور فلاں درخت کاٹ سکتے تھے جن کے کاٹنے سے کچھ زیادہ نقصان نہ ہوتا لیکن وہ درخت تو انھوں نے کھڑے چھوڑ دیے اور یہ اچھے بھلے، مثمر درخت انھوں نے کاٹ کے ڈھیر کر دیے جس سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ اقدام کسی واقعی ناگزیر ضرورت کے لیے نہیں بلکہ محض انتقام کے جذبہ کے تحت، معاشی تباہی پھیلانے کے لیے کیا گیا ہے جو اصلاح نہیں بلکہ صریح اِفساد ہے۔

'فَبِاِذْنِ اللّٰهِ وَلِيُخْزِيَ الْفٰسِقِيْنَ'۔ یہ اس اعتراض کا جواب دیا ہے لیکن معترضین کو مخاطب کرنے کے بجائے صرف مسلمانوں کو مخاطب کیا ہے کہ تم ان ناصحوں کی مطلق پروا نہ کرو کہ تمھیں کون درخت کاٹنے اور کون چھوڑنے تھے۔ تم نے جو کچھ کیا رسول کی موجودگی میں، اس کی ہدایت کے تحت، کیا جس کے معنی یہ ہیں کہ یہ کام اللہ کے اِذن کے تحت ہوا ہے اور جب اللہ کے اذن کے تحت ہوا تو اللہ سے بڑھ کر کوئی حکمت و مصلحت کو جاننے والا ہو سکتا اور نہ اصلاح و افساد کے درمیان امتیاز کرنے والا۔

'وَلِيُخْزِيَ الْفٰسِقِيْنَ'۔ یعنی اللہ تعالیٰ نے تم کو اس لیے یہ اذن دیا کہ ان عہد شکنوں اور غداروں کو رسوا کرے اور یہ اپنی آنکھوں سے دیکھیں کہ انھوں نے جو درخت بڑے ارمانوں سے لگائے وہ ان کے سامنے کاٹے جا رہے ہیں لیکن وہ اتنے بے بس ہیں کہ چوں بھی نہیں کر سکتے۔ لفظ 'فاسق' یہاں غدار اور عہد شکن کے مفہوم میں ہے اور اس مفہوم میں یہ لفظ قرآن میں جگہ جگہ استعمال ہوا ہے۔

یہاں معترضوں اور نکتہ چینیوں کو خطاب نہ کرنے کی وجہ یہ ہے کہ یہ اعتراض ایک بالکل نامعقول اعتراض تھا جو انھوں نے محض اپنے دل کا بخار نکالنے کے لیے اٹھایا۔ اس وجہ سے وہ لائق خطاب نہ تھے البتہ مسلمانوں کو خطاب کر کے ان کے اس فعل کی تصویب فرما دی تاکہ غداروں کو اس سے رنج بھی پہنچے اور ساتھ ہی منافقوں کو بھی تنبیہ ہو جائے کہ وہ اس کو وسوسہ اندازی کا ذریعہ نہ بنائیں۔

رہا یہ سوال کہ مسلمان بحالتِ جنگ دشمنوں کے باغوں اور کھیتوں کو اجاڑ سکتے ہیں یا نہیں تو یہ کوئی اہم سوال نہیں ہے۔ اگر جنگ کی ضرورت داعی ہو تو وہ ان کے گھروں کو بھی مسمار کر سکتے ہیں چہ جائیکہ ان کے باغ اور کھیت۔ لیکن جنگ کی ضرورت داعی نہ ہو تو ان کی کسی چھوٹی سے چھوٹی چیز کو بھی نقصان پہنچانا مسلمانوں کے لیے جائز نہیں ہے۔

وَمَآ اَفَآءَ اللّٰهُ عَلٰى رَسُوْلِهٖ مِنْهُمْ فَمَآ اَوْجَفْتُمْ عَلَيْهِ مِنْ خَيْلٍ وَّلَا رِكَابٍ وَّلٰكِنَّ اللّٰهَ يُسَلِّطُ رُسُلَهٗ عَلٰى مَنْ يَّشَآءُ ۭ وَاللّٰهُ عَلٰى كُلِّ شَيْءٍ قَدِيْرٌ (۶)

ایک دوسرے سوال کا جواب

یہ دوسرے سوال کا جواب ہے جو بنی نضیر کی متروکہ املاک سے متعلق پیدا ہوا اور جس کو منافقین نے اپنی حرصِ مال کی وجہ سے زیادہ شدت کے ساتھ ہوا دی۔ ان کا مطالبہ یہ تھا کہ یہ بھی دشمن سے حاصل شدہ مال ہے اس وجہ سے اس کو بھی مالِ غنیمت کی طرح پانچواں حصہ نکال کر باقی ہر چیز فوجیوں میں تقسیم کر دی جائے۔ اس سے کچھ ہی پہلے جنگِ بدر کے موقع پر ایسا ہی کیا گیا تھا۔ اسی کو سامنے رکھ کر اس کے بارے میں بھی وہی مطالبہ کیا گیا لیکن قرآن نے دونوں صورتوں میں نمایاں فرق ہونے کی وجہ سے اس مطالبے کو تسلیم نہیں کیا۔ بدر کے موقع پر مجاہدین کو باقاعدہ جنگ کرنی پڑی تھی جس میں ان کو اپنے اسلحہ اور اونٹ گھوڑے کام میں لانے پڑے جب کہ اس موقع پر اس طرح کی کوئی بات نہیں ہوئی بلکہ اللہ کے رسول کے دبدبہ سے مرعوب ہو کر دشمن نے اپنا علاقہ خود خالی کر دیا۔ اس فرق کی وجہ سے اس کے متعلق حکم ہوا کہ اس کی حیثیت مالِ فَے کی ہے جس کو اللہ تعالیٰ نے خود اپنے دشمنوں سے اپنے رسول کو دلوایا ہے چنانچہ یہ کل کا کل اللہ و رسول یا بالفاظ دیگر اسلامی حکومت کی ملکیت ہوگا اور اسلام اور مسلمانوں کی اجتماعی بہبود میں صرف ہوگا۔

مالِ فَے اور اس کا حکم

اسی 'مَآ اَفَآءَ اللّٰهُ' سے اسلامی مالیات میں ایک مستقل اصطلاح مالِ فَے کی پیدا ہو گئی جس سے وہ مال مراد ہوا کرتا ہے جو دشمن سے بغیر جنگ کے حاصل ہوا ہو۔ 'فَے' کے معنی لوٹانے کے ہیں یعنی اللہ تعالیٰ اس مال کو غاصبوں سے لے کر اس کے حقیقی حق داروں کو لوٹا دیتا ہے۔

'فَمَآ اَوْجَفْتُمْ عَلَيْهِ مِنْ خَيْلٍ وَّلَا رِكَابٍ' سے معلوم ہوتا ہے کہ فوجیوں کو مالِ غنیمت سے جو حصہ دیا جاتا تھا اس کی وجہ یہ تھی کہ انھیں اپنے ذاتی اسلحہ، گھوڑے اور اونٹ جنگ میں استعمال کرنے پڑتے تھے یہاں تک کہ اپنا زادِ راہ بھی ساتھ رکھنا ہوتا تھا۔ اب صورتِ حال بالکل تبدیل ہو گئی ہے اس وجہ سے اس زمانے میں دشمن سے جو کچھ بھی حاصل ہوگا اس کی حیثیت فَے کی ہوگی، خواہ جنگ سے حاصل ہو یا صلح سے۔

'وَلٰكِنَّ اللّٰهَ يُسَلِّطُ رُسُلَهٗ عَلٰى مَنْ يَّشَآءُ ۭ وَاللّٰهُ عَلٰى كُلِّ شَيْءٍ قَدِيْرٌ'۔ سورۂ مجادلہ کی آیت ۲۱ میں گزر چکا ہے کہ 'كَتَبَ اللّٰهُ لَاَغْلِبَنَّ اَنَا وَرُسُلِيْ' (اللہ نے لکھ رکھا ہے کہ میں غالب

رہوں گا اور میرے رسول) اس سنتِ الٰہی کے تحت رسول کے لیے غلبہ ضروری ہے۔ اس غلبہ کے لیے اللہ کا رسول اپنے رب کے سوا کسی اور کی مدد کا محتاج نہیں ہے اور اس کا رب ہر چیز پر قادر ہے۔ وہ چاہے تو اس کو دشمنوں کے بڑے سے بڑے ملک پر بغیر کسی فوج ہی کے غالب کر دے۔ اہل ایمان سے اگر وہ مدد کا طالب ہوتا ہے تو اس وجہ سے نہیں کہ وہ ان کی مدد کا محتاج ہے بلکہ اس سے ایک مقصد تو یہ ہوتا ہے کہ ان کے لیے حصولِ سعادت کی راہ کھلے اور دوسرا مقصد یہ ہوتا ہے کہ مخلص اور منافق میں امتیاز ہو جائے۔

مَآ اَفَآءَ اللّٰهُ عَلٰى رَسُوْلِهٖ مِنْ اَهْلِ الْقُرٰى فَلِلّٰهِ وَلِلرَّسُوْلِ وَلِذِى الْقُرْبٰى وَالْيَتٰمٰى وَالْمَسٰكِيْنِ وَابْنِ السَّبِيْلِ ۙ كَىْ لَا يَكُوْنَ دُوْلَةً ۢ بَيْنَ الْاَغْنِيَآءِ مِنْكُمْ ۚ وَمَآ اٰتٰىكُمُ الرَّسُوْلُ فَخُذُوْهُ ۚ وَمَا نَهٰىكُمْ عَنْهُ فَانْتَهُوْا ۚ وَاتَّقُوا اللّٰهَ ۗ اِنَّ اللّٰهَ شَدِيْدُ الْعِقَابِ (۷)

مالِ غنیمت اور مالِ فے کے درمیان فرق واضح کرنے کے بعد یہ مالِ فے کا مصرف بتا دیا کہ یہ کُل کا کُل اللہ، رسول، رسول کے متعلقین، یتیموں، مسکینوں اور مسافروں کے لیے ہو گا۔ یعنی اس میں جنگ کرنے والوں کا کوئی حصہ نہیں ہے۔ یہاں جو مصارف بیان ہوئے ہیں وہ سب سورۂ انفال میں اموالِ غنیمت کے سلسلہ میں زیرِ بحث آ چکے ہیں۔ اس وجہ سے یہاں ہم صرف خاص خاص باتوں ہی کی طرف توجہ دلائیں گے۔ تفصیل کے طالب تفسیر سورۂ انفال کی مراجعت کریں۔

'لِلّٰهِ وَلِلرَّسُوْلِ' میں جہاں تک اللہ تعالیٰ کا تعلق ہے، وہ کسی مال و متاع کا محتاج نہیں ہے۔ اس کے نام کا حصہ درحقیقت اس کے بندوں ہی کی طرف لوٹتا ہے اور اسلامی حکومت امین کی حیثیت سے اس کو مستحقین اور مسلمانوں کی اجتماعی بہبود کے کاموں میں صرف کرتی ہے۔

اسی طرح رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا حصہ اس میں بحیثیت رسول کے نہیں بلکہ بحیثیت اسلامی حکومت کے سربراہ کے ہے۔ رسول کی حیثیت سے آپ کی کفالت کی ذمہ داری اللہ تعالیٰ نے خود اپنے اوپر لی تھی جس کی تصریح خود قرآن میں ہے البتہ جب اسلامی حکومت وجود میں آئی اور اس کے فرائض کا بوجھ بھی آپ کے کندھوں پر پڑا تو ضروری ہوا کہ سرکاری خزانے سے آپ کو بھی اپنی ضروریات کے مطابق لینے کا حق ہو۔ آپ کا یہ حق چونکہ بحیثیت سربراہ حکومت کے تھا اس وجہ سے آپ کی وفات کے بعد یہ آپ کے خلیفہ کی طرف لوٹ گیا۔ اس کی نوعیت کسی ذاتی ملکیت کی نہیں تھی کہ آپ کے بعد اس کی وراثت کا سوال پیدا ہو۔ حضرات انبیاء علیہم السلام دین کی وراثت چھوڑتے ہیں، اموال و املاک کی وراثت نہیں چھوڑتے۔

'وَلِذِى الْقُرْبٰى' سے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے وہ اقرباء مراد ہیں جن کی کفالت کی

آپ پر ذمہ داری تھی۔ یہ چیز درحقیقت آپ کی ذاتی ضرورت ہی کا ایک حصہ تھی۔ اس کی نوعیت بھی کسی ذاتی جائداد کی نہیں تھی کہ آپ کے بعد یہ وراثت کی حیثیت سے آپ کے خاندان کی طرف لوٹے۔ جس طرح اسلام پر کسی خاص خاندان کا اجارہ نہیں ہے اسی طرح اسلام کی حکومت یا اس کے بیت المال کے کسی حصہ پر بھی کبھی کسی خاندان کا اجارہ نہ ہوا نہ ہو سکتا۔ اس قسم کے خیالات، یہودیوں کے زیر اثر مفسدین کے ایک گروہ نے مسلمانوں کے اندر پھیلائے لیکن ان کی کوئی بنیاد نہیں ہے۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے اقرباء کے بعد معاً یتامیٰ، مساکین اور مسافروں کے حق کا ذکر اسلامی نظام میں ان کے مرتبہ و مقام کو واضح کرتا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے ان کے حقوق کا ذکر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے قرابت داروں کے حق کے ساتھ فرمایا ہے۔ اسلامی حکومت کی اوّلین ذمہ داری ان لوگوں کی کفالت و سرپرستی ہے جو معاشرہ کے اندر بے وسیلہ ہیں۔ اس کے دوسرے فرائض کا درجہ اس کے بعد آتا ہے۔ اگر حکومت اس مقدم ضرورت کو نظر انداز کرکے دوسری ضرورتوں پر بیت المال کی آمدنی خرچ کرتی ہے تو ہر چند وہ ضرورتیں رفاہی اور تمدنی نقطۂ نظر سے اہمیت رکھنے والی ہی کیوں نہ ہوں لیکن وہ اصل حق داروں کے حقوق میں خیانت کی مجرم ہے۔ اور اس امر کے جواز کی تو کوئی گنجائش ہی نہیں ہے کہ کوئی اسلامی حکومت سرکاری خزانے کا ایک پیسہ بھی فضول قسم کی نمائشوں اور عیاشیوں پر صرف کرے۔ جو حکومت ایسا کرتی ہے وہ اسلامی حکومت نہیں بلکہ شیطانی حکومت ہے۔ اسی قسم کی حکومتوں کی بدولت اس دنیا پر وہ آفت نازل ہوئی جس کو اشتراکیت کہتے ہیں، جس نے انفرادی ملکیت کے تصور ہی کو سرے سے ایک جرم بلکہ تمام جرائم کی اصل قرار دے دیا۔ اور اس جرم کے استیصال کے لیے دنیا میں خون کی ندیاں بہا دیں۔

'کَیْ لَا یَکُوْنَ دُوْلَۃً بَیْنَ الْاَغْنِیَآءِ مِنْکُمْ'۔ 'دُوْلَۃٌ' کے معنی گردش کے ہیں۔ 'دالت الایام' کے معنی ہوں گے 'دار الزمان' زمانہ نے گردش کی۔ اسی سے 'مداولت' ہے جو قرآن میں بھی استعمال ہوا ہے: 'وَتِلْکَ الْاَیَّامُ نُدَاوِلُہَا بَیْنَ النَّاسِ' (آل عمران - ۳: ۱۴۰) (اور ہم ان ایام کو لوگوں کے درمیان گردش دیتے رہتے ہیں)۔ مطلب یہ ہے کہ غرباء و یتامیٰ اور بے وسیلہ لوگوں کا حق اس لیے سرکاری بیت المال میں محفوظ کر دیا ہے کہ دولت صرف مال داروں ہی کے درمیان نہ گردش کرتی رہے بلکہ اس کو غریبوں تک پہنچنے کی بھی راہ ملے۔

اس سے اسلامی اقتصادیات کا یہ اصول واضح ہوا کہ اسلام یہ نہیں پسند کرتا کہ دولت کسی خاص طبقہ کے اندر مرتکز ہو کر رہ جائے بلکہ وہ چاہتا ہے کہ اس کا بہاؤ ان طبقات کی طرف بھی ہو جو اپنی خلقی کمزوریوں یا فقدانِ وسائل کے سبب سے اس کے حصول کی جدوجہد میں پورا حصہ نہیں لے سکتے۔ اس مقصد کے لیے اس نے افراد کو زیادہ سے زیادہ انفاق پر ابھارا ہے اور ان کے اس آزادانہ انفاق کو ان کی روحانی ترقی کا سب سے بڑا ذریعہ قرار دیا ہے اور قانون کے ذریعہ سے بھی ہر صاحب مال کے مال میں سے ایک

حصہ غریبوں کے حق کی حیثیت سے الگ کر کے حکومت کی تحویل میں دے دیا ہے۔

وَمَا اٰتٰىكُمُ الرَّسُوْلُ فَخُذُوْهُ وَمَا نَهٰىكُمْ عَنْهُ فَانْتَهُوْا ۚ وَاتَّقُوا اللّٰهَ ۭ اِنَّ اللّٰهَ شَدِيْدُ الْعِقَابِ۔ یہ آخر میں تہدید و وعید ہے کہ رسول جو کچھ دے وہ لے لو اور جس چیز سے روکے اس سے رک جاؤ، کسی بات کو اعتراض و نکتہ چینی اور نجویٰ و سرگوشی کا بہانہ نہ بناؤ۔ اللہ سے برابر ڈرتے رہو اور یاد رکھو کہ اللہ بڑی ہی سخت سزا دینے والا ہے۔

معترضین کو تنبیہ

یہ تہدید و وعید دلیل ہے کہ جن سوالوں کے جواب یہاں دیے گئے ہیں وہ منافقین کی طرف سے اٹھائے گئے تھے اور ان کے اٹھانے سے مقصود مسئلہ کی تحقیق نہیں بلکہ، ان کی عادت کے مطابق، اعتراض و نکتہ چینی تھا۔ اگر سوال محض تحقیقِ حق کے لیے مخلص مسلمانوں کی طرف سے ہوتا تو اس تہدید کا یہاں کوئی موقع نہیں تھا۔

ایک حکم خاص سے ایک کلیہ کا استنباط

یہاں رسول کا یہ درجہ جو واضح فرمایا گیا ہے کہ جو کچھ وہ دے وہ لے لو اور جس سے روکے اس سے رک جاؤ، اگرچہ اس کا ایک خاص محل ہے لیکن اس سے جو حکم مستنبط ہوتا ہے وہ بالکل عام ہو گا یعنی زندگی کے ہر معاملے میں رسول کے ہر حکم و نہی کی بے چون و چرا تعمیل کی جائے گی اس لیے کہ رسول کی حیثیت، جیسا کہ قرآن میں تصریح ہے، اللہ تعالیٰ کی طرف سے مقرر کیے ہوئے ایک واجب الاطاعت ہادی کی ہوتی ہے۔ فرمایا ہے، 'وَمَآ اَرْسَلْنَا مِنْ رَّسُوْلٍ اِلَّا لِيُطَاعَ بِاِذْنِ اللّٰهِ' (النساء - ۴ : ۶۴) (اور ہم نے نہیں بھیجا کوئی رسول مگر اس لیے کہ اللہ کے حکم سے اس کی اطاعت کی جائے) گویا اس ٹکڑے کے دو مفہوم ہوں گے۔ ایک خاص، دوسرا عام۔ اپنے خاص مفہوم کے پہلو سے یہ اپنے سابق مضمون سے مربوط ہو گا اور اپنے عام مفہوم کے اعتبار سے اس کی حیثیت اسلامی شریعت کے ایک ہمہ گیر اصول کی ہو گی۔

لِلْفُقَرَآءِ الْمُهٰجِرِيْنَ الَّذِيْنَ اُخْرِجُوْا مِنْ دِيَارِهِمْ وَاَمْوَالِهِمْ يَبْتَغُوْنَ فَضْلًا مِّنَ اللّٰهِ وَرِضْوَانًا وَّيَنْصُرُوْنَ اللّٰهَ وَرَسُوْلَهٗ ۭ اُولٰٓئِكَ هُمُ الصّٰدِقُوْنَ (۸)

اموالِ فے کا ایک ہنگامی مصرف

اموالِ فے کا عام مصرف بتانے کے بعد یہ اس کے ایک خاص مصرف کی طرف اشارہ فرمایا جو وقت کا سب سے زیادہ اہمیت رکھنے والا مصرف اور تمام مسلمانوں کی یکساں توجہ کا مستحق تھا۔ یعنی مہاجرین کی امداد جو اس وقت ہر طرف سے اپنے گھروں سے اجڑ اکھڑ کر مدینہ آ رہے تھے۔ ظاہر ہے کہ ان کو از سرِ نو بسانے اور ان کی معاشی زندگی کو پھر سے متحرک کرنے کی ذمہ داری اس چھوٹے سے اسلامی معاشرہ ہی پر عائد ہوتی تھی جو ابھی نیا نیا مدینہ کی سرزمین میں ابھر رہا تھا۔ یہ صورت بھی متقضی تھی کہ اموالِ فے کو حکومت کی تحویل میں دیا جائے تاکہ اس طرح کے ملی مسائل کے حل کے لیے اس کے پاس وسائل موجود رہیں۔

مہاجرین کی تعریف

ان مہاجرین کی تعریف میں فرمایا کہ یہ لوگ اپنے گھروں اور اپنے مالوں سے مجبور کر کے نکالے گئے ہیں اور انھوں نے اللہ کے فضل اور اس کی خوشنودی کی طلب اور اللہ اور اس کے رسول کی نصرت کے مقصد

سے اپنی املاک سے یہ محرومی اور اپنے گھر در سے یہ مہجوری برداشت کی ہے اس وجہ سے یہ مستحق ہیں کہ ان کے دینی بھائی پوری فراخ دلی اور سیر چشمی سے ان کی مدد کریں۔ یَبْتَغُوْنَ فَضْلًا مِّنَ اللّٰہِ وَرِضْوَانًا سے اشارہ اس ایمانی زادِ راہ کی طرف ہے جس کے اعتماد پر یہ مہاجرین اپنے گھروں اور اپنی املاک سے بغیر اس بات کی پروا کیے اٹھ کھڑے ہوئے کہ کیا کھائیں گے اور کہاں سر چھپائیں گے۔ اور یَنْصُرُوْنَ اللّٰہَ وَرَسُوْلَهٗ سے اس مقصد کی طرف اشارہ ہے جس مقصدِ عزیز کے لیے یہ بازی انھوں نے کھیلی۔ یعنی انھوں نے یہ چاہا کہ وہ اللہ کے رسول کے ہم رکاب رہیں تاکہ ہر قدم پر اللہ اور اس کے رسول کی مدد کے لیے سر بکف رہ سکیں۔

اُولٰٓئِكَ هُمُ الصّٰدِقُوْنَ۔ فرمایا کہ یہی لوگ درحقیقت اپنے دعوائے ایمان میں سچے ہیں کہ انھوں نے اللہ کی رضا طلبی اور رسول کی نصرت کی راہ میں اپنا سب کچھ قربان کر دیا نہ کہ یہ منافقین جو مدعی تو ہیں ایمان کے لیکن اللہ کی راہ میں معمولی چوٹ کھانے کے لیے بھی تیار نہیں ہیں۔ بس یہ چاہتے ہیں کہ گھر بیٹھے بٹھائے بغیر لقمۂ تر ہاتھ آتا رہے۔ ان منافقین ہی کے بارے میں آگے اسی سورہ کی آیت ۱۱ میں فرمایا ہے کہ وَاللّٰہُ يَشْهَدُ اِنَّهُمْ لَكٰذِبُوْنَ (اور اللہ گواہی دیتا ہے کہ یہ منافقین بالکل جھوٹے ہیں)۔

وَالَّذِيْنَ تَبَوَّؤُ الدَّارَ وَالْاِيْمَانَ مِنْ قَبْلِهِمْ يُحِبُّوْنَ مَنْ هَاجَرَ اِلَيْهِمْ وَلَا يَجِدُوْنَ فِيْ صُدُوْرِهِمْ حَاجَةً مِّمَّآ اُوْتُوْا وَيُؤْثِرُوْنَ عَلٰٓى اَنْفُسِهِمْ وَلَوْ كَانَ بِهِمْ خَصَاصَةٌ ۚ وَمَنْ يُّوْقَ شُحَّ نَفْسِهٖ فَاُولٰٓئِكَ هُمُ الْمُفْلِحُوْنَ (۹)

انصار اور مہاجرینِ اوّلین کی سیر چشمی کی تحسین

یہ انصار و مہاجرینِ اوّلین کی سیر چشمی اور ان کی فراخ دلی کی تعریف ہے کہ اس بات سے ان کے دل تنگ نہیں ہو رہے ہیں کہ مہاجروں کے قافلے پر قافلے ان کے غنائم و فے میں حصہ بٹانے کے لیے چلے آ رہے ہیں بلکہ وہ بڑی فراخ دلی سے ان کا خیر مقدم کر رہے ہیں اور ان کی جو مدد کی جا رہی ہے اس سے اپنے دلوں میں کوئی رشک و حسد محسوس کرنے کے بجائے وہ اپنے اوپر ان کو ترجیح دیتے ہیں اگرچہ انھیں خود ضرورت لاحق ہو۔

عربیت کا ایک ضابطہ

'تَبَوَّؤُ الدَّارَ وَالْاِيْمَانَ' اسی طرح کی ترکیب ہے جس طرح 'عَلَفْتُهَا تِبْنًا وَمَاءً' (میں نے اس کو چارہ کھلایا اور پانی پلایا) یا 'زَجَّجْنَ الْحَوَاجِبَ وَالْعُيُوْنَا'، یا 'تَقَلَّدَ فِيْ سَيْفًا وَرُمْحًا' وغیرہ مختلف ترکیبیں عربی میں معروف ہیں۔ اس طرح کی ترکیبوں میں ایک فعل، جو دوسرے مفعول سے مناسبت رکھنے والا ہو، محذوف ہوتا ہے جو قرینہ سے سمجھ لیا جاتا ہے۔ چنانچہ مذکورہ تینوں مثالوں میں ایک ایک فعل محذوف ہے۔ اسی طرح اس آیت میں بھی ایک فعل 'الایمان' سے مناسبت رکھنے والا محذوف ہے۔ اگر یہاں 'احکموا' یا اس کے ہم معنی کوئی فعل محذوف مانئے تو پوری عبارت یوں ہوگی، 'تَبَوَّؤُ الدَّارَ وَاَحْكَمُوا الْاِيْمَانَ' یعنی جنھوں نے پہلے سے گھر ٹھکانا

بھی بنا رکھا ہے اور اپنے ایمان کو بھی مضبوط کر رکھا ہے۔

اس کے اوّلین مصداق تو ظاہر ہے کہ انصار ہی ہوں گے اس لیے کہ وہ پہلے سے اپنے گھر در بھی رکھتے تھے اور ایمان کی نعمت سے بھی متمتع تھے لیکن میرے نزدیک اس میں وہ مہاجرین اوّلین بھی شامل ہیں جو پہلے ہی ہجرت کر کے مدینہ پہنچ چکے تھے اور وہاں اللہ نے ان کے لیے قیام و معاش کی قابلِ اطمینان صورت بھی پیدا کر دی تھی۔ اس طرف ذہن 'مِنۡ قَبۡلِهِمۡ' کے الفاظ سے جاتا ہے۔ اس لیے کہ مہاجرین اوّلین ہی کا یہ درجہ ہے کہ انھوں نے مہاجرین متاخّرین کے مقابل میں ایمان اور ہجرت دونوں میں سبقت کی۔ جہاں تک انصار کا تعلق ہے ان کو گھر در والے ہونے کے معاملے میں تو تقدم ضرور حاصل تھا لیکن ایمان کے معاملہ میں یہ کہنا صحیح نہیں ہو سکتا کہ ان کو تمام مہاجرین کے مقابل میں تقدم حاصل تھا۔ زیادہ سے زیادہ یہ کہہ سکتے ہیں کہ بعد کے مہاجرین کے مقابل میں ان کو بحیثیتِ مجموعی تقدم حاصل تھا۔ ہاں انصار کے ساتھ اگر مہاجرین اوّلین کو بھی شامل کر لیجیے تب ان کے اوپر اَلَّذِيۡنَ تَبَوَّؤُ الدَّارَ وَالۡاِيۡمَانَ کے الفاظ ٹھیک ٹھیک منطبق ہو جاتے ہیں۔ اس لیے کہ یہ دونوں مل کر بعد والوں کے مقابل میں باعتبارِ سکونتِ مدینہ بھی متقدم ہیں اور باعتبارِ قبولِ اسلام بھی۔

فرمایا کہ یہ لوگ نئے آنے والے مہاجرین سے محبت رکھتے اور پوری فراخ دلی سے ان کا خیر مقدم کرتے ہیں۔ ان کے دل اس بات سے تنگ نہیں ہو رہے ہیں کہ مہاجرین کے قافلے پر قافلے چلے آ رہے ہیں اور جو مال انھیں ملنا چاہیے تھا وہ سب ان پر صرف ہو رہا ہے یا اب وہ بھی اس میں حصہ دار بن جائیں گے بلکہ وہ نہایت سیر چشمی کے ساتھ اپنی ضروریات پر ان کی ضرورت کو ترجیح دے رہے ہیں۔

ان کی اس تعریف سے مقصود یہ ظاہر کرنا ہے کہ اہلِ ایمان کو اسی طرح باہم دگر ہمدرد، فیاض اور ایثار کرنے والا ہونا چاہیے۔ یہ گویا ایک آئینہ رکھا گیا ہے ان منافقین کے سامنے جنھوں نے بنی نضیر کے چھوڑے ہوئے اموال سے متعلق یہ مطالبہ پیش کیا کہ اس کو مالِ غنیمت کی طرح لوگوں میں تقسیم کیا جانا چاہیے۔ اس آئینہ میں انھیں دکھایا گیا ہے کہ مسلمان اپنے دوسرے بھائی کے لیے اس طرح فیاض ہوتا ہے تاکہ انھیں اپنی خود غرضی پر کچھ شرم آئے۔

وَمَنۡ يُّوۡقَ شُحَّ نَفۡسِهٖ فَاُولٰٓئِكَ هُمُ الۡمُفۡلِحُوۡنَ' یہ ان انصار و مہاجرین کے لیے فلاح کی بشارت بھی ہے اور نفسِ انسانی کی ایک بہت خطرناک بیماری سے آگاہی بھی۔ 'شُحّ' کے معنی حرص و طمع اور لالچ کے ہیں۔ نفس کی طرف اس کی نسبت سے یہ بات تو نکلتی ہے کہ یہ نفس کے دواعی میں سے ایک داعیہ ہے لیکن ساتھ ہی اس سے بچتے رہنے کے لیے جو آگاہی دی گئی ہے اس سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ خطرناک داعیہ ہے۔ اگر اس کو آدمی قابو میں نہ رکھ سکے تو یہ چیز اس کی آخرت کو برباد کر دیتی ہے۔ اس ٹکڑے میں منافقین کو آگاہ فرمایا گیا ہے کہ وہ اس بیماری میں مبتلا ہیں۔ اگر انھوں نے اس کے علاج کی فکر نہ کی تو

وہ ابدی خسران سے دوچار ہوں گے۔ میں نے اس کے اسی خطرناک پہلو کو واضح کرنے کے لیے اس کا ترجمہ 'خود غرضی' کیا ہے۔ ایک حدیث میں اس کی وضاحت یوں آئی ہے "ایاکم والشح فانہ اھلک من کان قبلکم امرھم بالظلم فظلموا وامرھم بالفجور ففجروا وامرھم بالقطیعۃ فقطعوا" (تم خود غرضی) سے بچو! یہی چیز ہے جس نے تم سے پہلے کی قوموں کو تباہ کیا، اس نے ان کو ظلم کی راہ سجھائی تو انھوں نے ظلم کیے، اس نے ان کو فسق و فجور کا حکم دیا تو انھوں نے فسق و فجور کا ارتکاب کیا، اس نے ان کو قطع رحم پر ابھارا تو انھوں نے قطع رحم کیا)۔

ایک سوال اور اس کا جواب

ایک اہم سوال اس آیت کے موقع و محل سے متعلق بھی پیدا ہوتا ہے کہ یہاں یہ کیا بات بتانے کے لیے وارد ہوئی ہے؟ ہمارے مفسرین کا خیال تو یہ ہے کہ اوپر کی آیت میں جس طرح یہ بات بیان ہوئی ہے کہ اموالِ فئے میں مہاجرین کا حصہ ہے اسی طرح اس آیت میں بتایا گیا ہے کہ اس میں انصار کا بھی حصہ ہے، لیکن یہ بات کسی طرح سمجھ میں نہیں آتی۔ مہاجرین کے ذکر کی ضرورت تو اس وجہ سے تھی کہ ان کے سبب سے اس وقت حکومت ایک ایسی صورتِ حال سے دوچار تھی جو متقاضی ہوئی کہ حکومت کے پاس ایسے وسائل موجود رہیں کہ وہ اس طرح کی نازک صورتِ حال سے عہدہ برآ ہو سکے۔ گویا ان کا ذکر اموالِ فئے کے حکومت کی ملک میں دینے کی ایک دلیل کے طور پر آیا۔ اس ذیل میں انصار کے ذکر کی کیا ضرورت تھی؟ یہ شبہ تو کسی کے ذہن میں تھا نہیں کہ انصار اس مال میں حق دار نہیں ہیں۔ جب تمام یتامیٰ، فقراء اور مساکین کا حق اس میں بیان ہوا تو ظاہر ہے کہ انصار کے فقراء و مساکین بھی اس میں حق دار ٹھہرے۔ پھر انصار کے خاص طور پر ذکر کرنے کی ضرورت کیا پیش آئی اور وہ بھی 'وَالَّذِیْنَ تَبَوَّءُو الدَّارَ وَالْاِیْمَانَ' کی صفت کے ساتھ، جو ان کی احتیاج کو نہیں بلکہ ان کے مستغنی ہونے کو ظاہر کرتی ہے؟

ہمارے نزدیک مفسرین نے اس آیت کا موقع و محل بالکل نہیں سمجھا ہے۔ اس آیت کو اس بحث سے کوئی تعلق نہیں ہے کہ انصار اموالِ فئے میں حصہ دار ہیں یا نہیں۔ نہ کسی کے ذہن میں یہ سوال تھا، نہ اس کے پیدا ہونے کی کوئی وجہ تھی اور نہ اس کے جواب کا کوئی فائدہ تھا۔ یہاں جو بات بیان ہوئی ہے وہ یہ ہے کہ انصار اور مہاجرین اولین (جو پہلے سے گھر والے اور ایمان سے بہرہ مند ہیں) اپنی طرف ہجرت کر کے آنے والے بھائیوں کو منافقین کی طرح اپنے لیے کوئی معاشی خطرہ نہیں سمجھتے بلکہ ان کا محبت سے خیر مقدم کرتے اور ان کے لیے ہر قسم کا ایثار کرتے ہیں اور یہی رویہ ایمانی اخوت کا حقیقی تقاضا ہے۔ جو ہر سچے مسلمان کو اختیار کرنا چاہیے۔

وَالَّذِیْنَ جَآءُوْ مِنْۢ بَعْدِهِمْ یَقُوْلُوْنَ رَبَّنَا اغْفِرْ لَنَا وَلِاِخْوَانِنَا الَّذِیْنَ سَبَقُوْنَا بِالْاِیْمَانِ وَلَا تَجْعَلْ فِیْ قُلُوْبِنَا غِلًّا لِّلَّذِیْنَ اٰمَنُوْا رَبَّنَاۤ اِنَّكَ رَءُوْفٌ رَّحِیْمٌ (۱۰)

مہاجرین متاخرین کی تحسین

انصار اور مہاجرین اولین کا رویہ بیان کرنے کے بعد یہ مہاجرین متاخرین کا رویہ بیان فرمایا جا رہا ہے کہ ان کے دلوں میں بھی اپنے ان سابق الایمان اور سابق الہجرت بھائیوں کے لیے بڑا اخلاص اور بڑی

محبت ہے۔ ان کو یہ حسد نہیں ہے کہ انھوں نے پہلے پہنچ کر تمام میسر وسائل و اسباب پر قبضہ جما لیا اور گھر والے بن گئے جب کہ یہ ابھی ہر چیز سے محروم ہیں بلکہ یہ نہایت اخلاص کے ساتھ اپنے اور اپنے ان بھائیوں کے لیے دعا کر رہے ہیں کہ اے ہمارے رب، ہم کو بھی بخش اور ہمارے ان بھائیوں کو بھی بخش جن کو ایمان و ہجرت میں ہم پر سبقت کی سعادت حاصل ہوئی اور اے ہمارے رب، ہمارے دلوں کے اندر ہمارے باایمان بھائیوں کے خلاف کوئی کدورت نہ پیدا ہونے دے۔ اے ہمارے رب، تو نہایت شفیق و مہربان ہے۔

'وَلَا تَجْعَلْ فِيْ قُلُوْبِنَا غِلًّا لِّلَّذِيْنَ اٰمَنُوْا' میں ایک لطیف اشارہ اس بات کی طرف ہے کہ ایسا نہ ہو کہ اپنے مقابل میں ان کے بہتر حالات دیکھ کر شیطان ہمارے دلوں میں کوئی کینہ و حسد کا جذبہ پیدا کرے۔ بلکہ تو اپنی شفقت و عنایت سے ان کے حق میں ہمارے دلوں کو مہر و محبت سے معمور رکھنا۔ یہاں منافقین کے دلوں کے اس روگ پر نظر ہے جو اوپر 'شح' کے لفظ سے بیان ہوا ہے۔ مطلب یہ ہے کہ ان اصحاب صدق و صفا کے دل اس قسم کے امراض سے بالکل پاک صاف ہیں۔

۴۔ آگے آیات ۱۱-۱۷ کا مضمون

بنو نضیر کا انجام اپنی آنکھوں سے دیکھ لینے کے بعد بھی معلوم ہوتا ہے ان یہود دوست منافقین کی آنکھیں نہیں کھلیں۔ انھوں نے اس کے بعد بنو قریظہ کی پیٹھ ٹھونکنی شروع کر دی۔ یہود کی یہی ایک شاخ بنو نضیر کے بعد مدینہ کے قرب میں باقی رہ گئی تھی۔ قدرتی طور پر بنو نضیر کے واقعہ کے بعد ان کو اندیشہ ہو گیا ہو گا کہ اب شاید جلد ہی ان کی بھی باری آنے والی ہے۔ ممکن ہے اپنے ہمدردوں سے انھوں نے ساز باز بھی شروع کر دی ہو۔ منافقین نے ان کی ہمت بندھائی کہ آپ لوگ ہراساں نہ ہوں۔ بنو نضیر کی طرح اگر آپ لوگ بھی نکالے گئے تو ہم بھی آپ لوگوں کا ساتھ دیں گے اور آپ کے بارے میں محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) اور ان کے ساتھیوں کی کسی بات کی ہرگز کوئی پروا نہیں کریں گے اور اگر جنگ کی نوبت آئی تو ہم آپ کے ساتھ سربکف ہو کر لڑیں گے۔ قرآن نے مسلمانوں کو اطمینان دلایا کہ یہ بالکل بزدل اور جھوٹے ہیں۔ نہ یہ جلا وطنی میں ساتھ دینے والے ہیں نہ جنگ میں۔ اور اگر جنگ میں انھوں نے ان کا ساتھ دیا تو منہ کی کھائیں گے اور پھر کبھی ان کو منہ دکھانا نصیب نہ ہو گا۔ ساتھ ہی بنو قریظہ کو تنبیہ کر دی کہ اگر وہ ان کے چکمے میں آ گئے تو ان کا حشر بھی وہی ہو گا جو بنو نضیر کا ہوا اور یہ شیطان کی طرح یہ کہہ کر الگ ہو جائیں گے کہ 'اِنِّيْ بَرِيْٓءٌ مِّنْكَ اِنِّيْٓ اَخَافُ اللّٰهَ رَبَّ الْعٰلَمِيْنَ' (الحشر ۵۹: ۱۶) (میں تم سے بری ہوں، میں اللہ، عالم کے خداوند سے ڈرتا ہوں) ——— اس روشنی میں آیات کی تلاوت کیجیے۔

آیات ۱۱-۱۷

أَلَمْ تَرَ إِلَى الَّذِينَ نَافَقُوا يَقُولُونَ لِإِخْوَانِهِمُ الَّذِينَ كَفَرُوا
مِنْ أَهْلِ الْكِتَابِ لَئِنْ أُخْرِجْتُمْ لَنَخْرُجَنَّ مَعَكُمْ وَلَا
نُطِيعُ فِيكُمْ أَحَدًا أَبَدًا وَإِنْ قُوتِلْتُمْ لَنَنْصُرَنَّكُمْ
وَاللَّهُ يَشْهَدُ إِنَّهُمْ لَكَاذِبُونَ ﴿۱۱﴾ لَئِنْ أُخْرِجُوا لَا يَخْرُجُونَ
مَعَهُمْ وَلَئِنْ قُوتِلُوا لَا يَنْصُرُونَهُمْ وَلَئِنْ نَصَرُوهُمْ
لَيُوَلُّنَّ الْأَدْبَارَ ثُمَّ لَا يُنْصَرُونَ ﴿۱۲﴾ لَأَنْتُمْ أَشَدُّ رَهْبَةً
فِي صُدُورِهِمْ مِنَ اللَّهِ ذَٰلِكَ بِأَنَّهُمْ قَوْمٌ لَا يَفْقَهُونَ ﴿۱۳﴾
لَا يُقَاتِلُونَكُمْ جَمِيعًا إِلَّا فِي قُرًى مُحَصَّنَةٍ أَوْ مِنْ وَرَاءِ
جُدُرٍ بَأْسُهُمْ بَيْنَهُمْ شَدِيدٌ تَحْسَبُهُمْ جَمِيعًا وَ
قُلُوبُهُمْ شَتَّىٰ ذَٰلِكَ بِأَنَّهُمْ قَوْمٌ لَا يَعْقِلُونَ ﴿۱۴﴾ كَمَثَلِ
الَّذِينَ مِنْ قَبْلِهِمْ قَرِيبًا ذَاقُوا وَبَالَ أَمْرِهِمْ وَلَهُمْ
عَذَابٌ أَلِيمٌ ﴿۱۵﴾ كَمَثَلِ الشَّيْطَانِ إِذْ قَالَ لِلْإِنْسَانِ
اكْفُرْ فَلَمَّا كَفَرَ قَالَ إِنِّي بَرِيءٌ مِنْكَ إِنِّي أَخَافُ
اللَّهَ رَبَّ الْعَالَمِينَ ﴿۱۶﴾ فَكَانَ عَاقِبَتَهُمَا أَنَّهُمَا فِي النَّارِ
خَالِدَيْنِ فِيهَا وَذَٰلِكَ جَزَاءُ الظَّالِمِينَ ﴿۱۷﴾

ع ۵

ترجمہ آیات ۱۱-۱۷

کیا تم نے ان لوگوں کو نہیں دیکھا جو نفاق میں مبتلا ہیں وہ اپنے ان بھائیوں سے
جنھوں نے اہل کتاب میں سے کفر کیا ہے، کہتے ہیں کہ اگر آپ لوگ نکالے جاؤ گے
تو ہم بھی لازماً آپ لوگوں کے ساتھ نکل جائیں گے اور آپ لوگوں کے بارے میں ہم

کسی کی بھی بات نہیں مانیں گے اور اگر آپ لوگوں سے جنگ کی گئی تو ہم ضرور آپ لوگوں کی مدد کریں گے! اور اللہ گواہی دیتا ہے کہ یہ بالکل جھوٹے ہیں۔ اگر وہ نکالے گئے تو یہ ان کے ساتھ نہیں نکلیں گے اور اگر ان سے جنگ کی گئی تو یہ ان کی مدد نہیں کریں گے اور اگر ان کی مدد بھی کریں گے تو پیٹھ دکھائیں گے پھر ان کی کوئی مدد نہیں ہو گی۔ ۱۱-۱۲

اللہ کے بالمقابل تمہاری دہشت ان کے دلوں میں زیادہ ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ یہ سمجھ رکھنے والے لوگ نہیں ہیں۔ یہ تم سے کبھی اکٹھے ہو کر میدان میں نہیں لڑیں گے بلکہ قلعہ بند بستیوں میں یا دیواروں کی اوٹ سے لڑیں گے۔ ان کے درمیان شدید مخاصمت ہے۔ تم ان کو متحد گمان کر رہے ہو حالانکہ ان کے دل پھٹے ہوئے ہیں۔ اس کا سبب یہ ہے کہ یہ عقل سے کام نہیں لیتے۔ ۱۳-۱۴

(جن کو یہ شہ دے رہے ہیں) ان کا وہی حال ہو گا جو ان لوگوں کا ہوا جو ان سے کچھ ہی پہلے اپنے کیے کا وبال چکھ چکے ہیں اور ان کے لیے ایک دردناک عذاب بھی ہے۔ (اور یہ شہ دینے والے) شیطان کے مانند ہیں جو انسان سے کہتا ہے کہ کفر کر، پھر جب وہ کفر کر بیٹھتا ہے تو اس وقت وہ کہتا ہے کہ میں تجھ سے بری ہوں، میں اللہ ربّ العٰلمین سے ڈرتا ہوں۔ پس انجام کار دونوں ہی دوزخ میں ہمیشہ رہنے والے بن کر پڑیں گے۔ اور اپنی جانوں پر ظلم ڈھانے والوں کا بدلہ یہی ہے۔ ۱۵-۱۷

۵۔ الفاظ کی تحقیق اور آیات کی وضاحت

اَلَمْ تَرَ اِلَی الَّذِیْنَ نَافَقُوْا یَقُوْلُوْنَ لِاِخْوَانِهِمُ الَّذِیْنَ کَفَرُوْا مِنْ اَهْلِ الْکِتٰبِ

لَئِنْ اُخْرِجْتُمْ لَنَخْرُجَنَّ مَعَكُمْ وَلَا نُطِيْعُ فِيْكُمْ اَحَدًا اَبَدًا ۙ وَّاِنْ قُوْتِلْتُمْ لَنَنْصُرَنَّكُمْ ۭ وَاللّٰهُ يَشْهَدُ اِنَّهُمْ لَكٰذِبُوْنَ (۱۱)

منافقین کا ساز باز بنو قریظہ سے

'اَلَمْ تَرَ' کا خطاب یہاں اظہارِ تعجب کے لیے ہے۔ مطلب یہ ہے کہ ذرا ان مدّعیانِ ایمان کو تو دیکھو، ایک طرف ایمان کا دعویٰ ہے دوسری طرف ان اہلِ کتاب سے، جنھوں نے محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) کی دعوت و رسالت کا انکار کیا ہے، محبت کی پینگیں بھی بڑھائی جا رہی ہیں۔

'لِاِخْوَانِهِمُ' کے لفظ سے یہ بات واضح ہو رہی ہے کہ جن منافقین کا ذکر ہے یہ یہودیوں ہی کے اندر سے آئے ہوئے تھے۔ اپنے مصالح کی خاطر یہ یہودیوں سے تو نکل آئے لیکن یہودیت ان کے اندر سے نہیں نکلی تھی۔ اپنے سیاسی و معاشی مفادات کے حد تک یہ مسلمانوں کے ساتھ تھے باقی ان کی اصل ہمدردی اپنے بھائیوں ہی کے لیے تھی۔ یہاں یہ بات یاد رکھنی چاہیے کہ منافقین میں زیادہ تعداد انہی افراد کی تھی جو پہلے یہودی تھے اور انہی کا ردیّہ ان سورتوں میں زیرِ بحث ہے۔ عربوں میں سے جو لوگ اسلام لائے ان میں منافق بہت کم تھے اور ان کے نفاق کی نوعیت بھی مختلف تھی۔ آگے سورۂ ممتحنہ میں اس گروہ کا ردیّہ زیرِ بحث آئے گا۔

'اَلَّذِيْنَ كَفَرُوْا مِنْ اَهْلِ الْكِتٰبِ' میں یہود کے جس گروہ کی طرف اشارہ ہے اس کے تعین میں لوگوں کو بڑا اضطراب پیش آیا ہے لیکن میں اس بات پر مطمئن ہوں کہ یہ اشارہ یہود بنی قریظہ کی طرف ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ مدینہ کے جوار میں یہود کے تین ہی بڑے قبیلے آباد تھے: بنو قینقاع، بنو نضیر اور بنو قریظہ۔ بنو قینقاع کا قصہ پہلے ہی پاک ہو چکا تھا۔ بنو نضیر کا حشر اسی سورہ میں اوپر بیان ہوا۔ اس کے بعد صرف بنو قریظہ بچ رہے تھے جو مدینہ سے کچھ فاصلہ پر آباد تھے اس وجہ سے منافقین کے جس ساز باز کا ذکر ہے وہ انہی کے ساتھ ہو سکتا ہے۔ ان کا خاتمہ غزوہ خندق کے مابعد ہوا ہے جس کی تفصیل سورۂ احزاب میں گزر چکی ہے۔

'لَئِنْ اُخْرِجْتُمْ لَنَخْرُجَنَّ مَعَكُمْ وَلَا نُطِيْعُ فِيْكُمْ اَحَدًا اَبَدًا ۙ وَّاِنْ قُوْتِلْتُمْ لَنَنْصُرَنَّكُمْ'۔ ان منافقین نے ان کو اطمینان دلانا شروع کیا کہ اگر آپ لوگوں کو بھی بنو نضیر کی طرح یہاں سے نکالنے کی کوشش کی گئی تو ہم بھی آپ کے ساتھ نکل جائیں گے اور آپ لوگوں کے معاملے میں ہم کسی کے حکم یا مشورہ کی ہرگز کوئی پروا نہ کریں گے۔ اور اگر جنگ کی نوبت آئی تو ہم آپ لوگوں کی مدد کریں گے۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ بنو قریظہ کو یہ اندیشہ تھا کہ اب جلد ہی ان کی باری بھی آنے والی ہے اور یہ بھی اندازہ ہوتا ہے کہ ان منافقین کے وعدوں پر ان کو کچھ زیادہ بھروسہ نہیں تھا۔ وہ بنو نضیر کے معاملے میں اندازہ کر چکے تھے کہ یہ صرف زبان کے غازی ہیں۔ چنانچہ منافقین کو بڑی تاکید و توثیق کے ساتھ ان کو اپنے عہد پر مطمئن کرنے کی کوشش کرنی پڑی۔ یہاں تک کہ یہ اطمینان بھی انھوں نے دلایا کہ وہ اس معاملے میں کسی کی پروا

نہیں کریں گے۔ ظاہر ہے کہ یہ اشارہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اور مسلمانوں کی طرف ہے۔ مطلب یہ ہے کہ اگر ہمیں اپنے اس عہد کی خاطر ان لوگوں سے قطع تعلق بھی کر لینا پڑا تو ہم یہ بھی کر گزریں گے۔

'وَاللّٰهُ يَشْهَدُ اِنَّهُمْ لَكٰذِبُوْنَ' جس قسم و تاکید کے ساتھ ان منافقین نے بنو قریظہ کو اپنی حمایت کا یقین دلایا اسی تاکید و توثیق کے ساتھ اللہ تعالیٰ نے ان کو جھوٹا قرار دیا۔ 'وَاللّٰهُ يَشْهَدُ' کے الفاظ، ہم واضح کر چکے ہیں، کہ قسم کے مفہوم میں آتے ہیں۔

لَئِنْ اُخْرِجُوْا لَا يَخْرُجُوْنَ مَعَهُمْ ۚ وَلَئِنْ قُوْتِلُوْا لَا يَنْصُرُوْنَهُمْ ۚ وَلَئِنْ نَّصَرُوْهُمْ لَيُوَلُّنَّ الْاَدْبَارَ ۫ ثُمَّ لَا يُنْصَرُوْنَ (۱۲)

منافقین کی تردید

یہ قرآن نے ان کے ایک ایک قول و قرار کی تکذیب کر دی کہ وقت آنے پر یہ اپنی ایک بات میں بھی سچے ثابت نہیں ہوں گے۔ اگر وہ نکالے گئے تو یہ ان کا ساتھ نہیں دیں گے، اگر ان پر حملہ ہوا تو یہ ان کی حمایت میں لڑنے والے نہیں ہیں اور اگر اٹھے تو منہ کی کھائیں گے اور پیٹھ پھیر کر بھاگیں گے۔ چنانچہ یہی ہوا کہ وقت پر کوئی بھی ان کے کام نہ آیا۔ ان کے عبرت انگیز انجام کی تفصیل سورۂ احزاب کی تفسیر میں گزر چکی ہے۔

وقت پر بنو قریظہ کا کسی نے ساتھ نہ دیا

یہاں بالاجمال اتنی بات یاد رکھیے کہ بنو نضیر کی طرح انھوں نے بھی آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ امن و صلح کا معاہدہ کر رکھا تھا۔ غزوۂ خندق کے موقع پر مشہور یہودی حیّ بن اخطب نے ان کو نقض عہد پر ابھارا۔ اس نے ان کو سمجھایا کہ اس وقت قریش اور غطفان اپنی پوری جمعیت کے ساتھ مسلمانوں پر حملہ آور ہو رہے ہیں، اگر تم بھی میدان میں آ جاؤ تو بس سمجھو کہ مسلمانوں کا خاتمہ ہے۔ اس کے چکمے میں آ کر بنو قریظہ بھی معاہدہ توڑ کر حملہ آوروں میں شریک ہو گئے۔ غزوۂ خندق کا جو انجام ہوا وہ معلوم ہے۔ اس سے فارغ ہوتے ہی حضورؐ نے بنو قریظہ کا رخ کیا اور ان کا محاصرہ کر لیا۔ اس وقت کسی نے بھی ان کا ساتھ نہیں دیا بالآخر انھیں مجبور ہو کر اپنی قسمت کا فیصلہ حضرت سعد بن معاذؓ کے ہاتھ میں دینا پڑا۔ اس فیصلہ کی تفصیل سورۂ احزاب میں گزر چکی ہے۔ اللہ تعالیٰ نے حضرت سعدؓ کے ہاتھوں ان کی جڑ ہی کاٹ دی۔

'ثُمَّ لَا يُنْصَرُوْنَ' یعنی پھر ان کے لیے امید کے تمام دروازے بند ہو جائیں گے۔ یہ اللہ کی فیصلہ کن پکڑ ہو گی اور جو لوگ اللہ کی پکڑ میں آ جاتے ہیں ان کو پھر کوئی بھی سہارا نہیں دے سکتا۔

لَاَنْتُمْ اَشَدُّ رَهْبَةً فِيْ صُدُوْرِهِمْ مِّنَ اللّٰهِ ۭ ذٰلِكَ بِاَنَّهُمْ قَوْمٌ لَّا يَفْقَهُوْنَ (۱۳)

جو اللہ سے نہیں ڈرتے وہ بندوں سے ڈرتے ہیں

یعنی تمہارے مقابل میں یہ اپنے ان بھائیوں کی نصرت کے لیے اس وجہ سے نہیں اٹھیں گے کہ اللہ سے زیادہ تمہاری دہشت ان کے دلوں میں سمائی ہوئی ہے۔ اللہ کی مخالفت اور نافرمانی تو یہ سرّاً بھی کرتے ہیں اور علانیۃً بھی لیکن تمہارے مقابل میں اٹھنے کا حوصلہ یہ کبھی کرنے والے نہیں ہیں۔

'ذٰلِكَ بِاَنَّهُمْ قَوْمٌ لَّا يَفْقَهُوْنَ' یعنی یہ بات ہے تو عجیب سی کہ یہ خدا سے ڈھیٹ اور تم سے

دہشت زدہ ہیں لیکن جن کی مت ماری جاتی ہے ان کا یہی حال ہوتا ہے کہ وہ صاحب تازیانہ سے نہیں بلکہ صرف تازیانہ سے ڈرتے ہیں۔ اگر ان کے اندر ذرا بھی عقل و ایمان کی رمق ہوتی تو یہ سوچ سکتے تھے کہ جب وہ اپنے اصل مالک کو اپنے اوپر غضب ناک بنا چکے ہیں تو اس کے دربانوں اور نوکروں سے چھپ کر کتنے دن اپنے کو بچا سکیں گے۔ یہ امر یہاں ملحوظ رہے کہ عقل اور فطرت کے بدیہی حقائق کے سمجھنے سے دل اس وقت محروم ہوتا ہے جب بدیہیات کی خلاف ورزی کے جرم میں اللہ تعالیٰ اس پر مہر کر دیا کرتا ہے: چنانچہ منافقین ہی کے باب میں ارشاد ہوا ہے کہ ذٰلِکَ بِاَنَّهُمْ اٰمَنُوْا ثُمَّ كَفَرُوْا فَطُبِعَ عَلٰى قُلُوْبِهِمْ فَهُمْ لَا يَفْقَهُوْنَ (المنٰفقون - ۶۳: ۳) (یہ اس وجہ سے ہوا کہ وہ پہلے ایمان لائے پھر انھوں نے کفر کیا پس ان کے دلوں پر مہر کردی گئی، پس وہ سمجھنے سے رہ گئے)۔

لَا يُقَاتِلُوْنَكُمْ جَمِيْعًا اِلَّا فِيْ قُرًى مُّحَصَّنَةٍ اَوْ مِنْ وَّرَآءِ جُدُرٍ ۭ بَاْسُهُمْ بَيْنَهُمْ شَدِيْدٌ ۭ تَحْسَبُهُمْ جَمِيْعًا وَّقُلُوْبُهُمْ شَتّٰى ۭ ذٰلِكَ بِاَنَّهُمْ قَوْمٌ لَّا يَعْقِلُوْنَ (۱۴)

یعنی ان بزدلوں کی ان گیدڑ بھبکیوں کو ذرا اہمیت نہ دو۔ ان میں اتنا جیوٹ نہیں ہے کہ یہ کبھی میدان میں نکل کر، منظم فوج کشی کی صورت میں، تم سے نبرد آزمائی کا حوصلہ کر سکیں۔ میدان میں نکلنا تو درکنار، ان پر اگر حملہ بھی ہوا تو یہ باہر نکل کر مدافعت کا حوصلہ نہیں کریں گے بلکہ بستیوں میں قلعہ بند ہو کر یا گھروں میں محصور ہو کر، دیواروں کی اوٹ ہی سے، اپنے کو بچانے کی کوشش کریں گے۔ یہ امر واضح رہے کہ قلعہ بند یا محصور ہو کر اوّل تو صرف دفاعی جنگ ہی لڑی جا سکتی ہے، حملہ آورانہ جنگ کا اس صورت میں سوال ہی پیدا نہیں ہوتا، ثانیاً دفاعی پہلو سے بھی سب سے زیادہ کمزور جنگ یہی ہے۔ صرف مجبوری کی حالت ہی میں یہ طریقہ اختیار کیا جا سکتا ہے۔ یہود کے متعلق یہ بات یاد رکھیے کہ یہ مسلمانوں کے خلاف قریش اور ان کے حلیفوں کو ابھارنے کے معاملے میں تو بڑے شاطر رہے ہیں لیکن یہ کبھی کھل کر میدان میں نہیں آئے اور جب مسلمانوں نے ان پر کبھی حملہ کیا تو انھوں نے ہمیشہ قلعہ بند اور محصور ہو کر مدافعت کی کوشش کی اور اس میں ناکامی بلکہ ذلت سے دوچار ہوئے۔

بزدلوں کی اصل کمزوری

بَاْسُهُمْ بَيْنَهُمْ شَدِيْدٌ ۭ تَحْسَبُهُمْ جَمِيْعًا وَّقُلُوْبُهُمْ شَتّٰى۔ مطلب یہ ہے کہ ان کو تم سے کھلے میدان میں مقابلہ کا حوصلہ تو جب ہو کہ ان کے دل آپس میں جڑے ہوئے ہوں۔ جہاں تک اسلام دشمنی کا تعلق ہے اس میں تو یہ بے شک متحد ہیں جس سے آدمی کو دھوکا ہوتا ہے کہ ان کے اندر وحدت فکر ہے لیکن حقیقت اس کے بالکل برعکس ہے۔ مخالفتِ اسلام کے منفی مقصد کے سوا ہر معاملے میں ان کے دلوں کے اندر ایک دوسرے کے خلاف شدید بغض و عناد ہے۔ یہود کی مختلف شاخوں کے اندر بھی عداوت جاگزیں ہے اور قریش و قبائلِ مشرکین کے ساتھ بھی ان کی دوستی بالکل نمائشی محض اسلام کی مخالفت کی حد تک ہے۔ ایسے بے ثبات اور نمائشی اتحاد میں اتنا دم داعیہ کہاں کہ وہ کھلے میدان میں

ان لوگوں کے مقابل میں پابرجا رہ سکے جن کے دلوں کو اللہ کے ایمان نے ایک دوسرے کے ساتھ جوڑا ہے۔

'ذٰلِكَ بِاَنَّهُمْ قَوْمٌ لَّا يَعْقِلُوْنَ' یہ ان کی بیماری کے اصل سبب کی طرف اشارہ فرمایا ہے کہ یہ عقل سے کام لینے والے لوگ نہیں ہیں۔ یعنی حقائق پر غور کرنے، سنجیدگی سے ان کا موازنہ کرنے اور پھر پورے عزم و ثبات سے ان کا مواجہہ کرنے کی جگہ انھوں نے اپنی باگ اپنی خواہشوں کے ہاتھ میں پکڑا دی ہے اور جب کوئی قوم عقل کی جگہ اپنی خواہشوں کو امام بنا لیتی ہے تو وہ، اسی طرح کے انتشار فکر میں مبتلا ہو کر تباہ ہو جاتی ہے۔

كَمَثَلِ الَّذِيْنَ مِنْ قَبْلِهِمْ قَرِيْبًا ذَاقُوْا وَبَالَ اَمْرِهِمْ ۚ وَلَهُمْ عَذَابٌ اَلِيْمٌ (۱۵)

بنو نضیر کے انجام کی مثال

یہ مثال دی ہے ان لوگوں کے انجام کی جن کو یہ منافقین ابھار رہے تھے کہ اگر آپ لوگ نکالے گئے تو ہم بھی آپ کے ساتھ نکل جائیں گے اور اگر آپ لوگوں پر حملہ ہوا تو ہم بھی آپ کے ساتھ ہو کر لڑیں گے۔ فرمایا کہ اگر یہ لوگ ان کی بھڑی میں آ کر کوئی غلط قدم اٹھا بیٹھے تو یاد رکھیں کہ ان کا انجام بھی وہی ہو گا جو ان لوگوں کا ہو چکا ہے جو ابھی جلدی ہی اپنی شرارت کا مزا چکھ چکے ہیں۔

'اَلَّذِيْنَ مِنْ قَبْلِهِمْ قَرِيْبًا ذَاقُوْا وَبَالَ اَمْرِهِمْ' سے عام طور پر لوگوں نے قریش کو مراد لیا ہے۔ ان کے نزدیک یہ اشارہ غزوۂ بدر کی طرف ہے کہ جس طرح بدر میں قریش کو منہ کی کھانی پڑی اسی طرح یہ لوگ بھی منہ کی کھائیں گے۔

یہ اشارہ اگرچہ قریش کی طرف بھی ہو سکتا ہے، بلکہ بنو قینقاع کی طرف بھی ہو سکتا ہے، جیسا کہ ابن کثیرؒ نے سمجھا ہے، لیکن میں اوپر عرض کر چکا ہوں کہ ان آیات میں اس سازش کی تفصیل بیان ہو رہی ہے جو بنو نضیر کی جلاوطنی کے بعد منافقین نے بنو قریظہ کے ساتھ کرنی شروع کی تھی، اس وجہ سے میرے نزدیک یہ اشارہ بنو نضیر کے انجام کی طرف ہے۔ اس کی وجہ اول تو یہ ہے کہ بنو نضیر کی مثال بالکل تازہ تھی، جیسا کہ 'قَرِيْبًا' کے الفاظ سے واضح ہے۔ دوسری یہ ہے کہ یہود کے کسی گروہ کے لیے سب سے زیادہ مؤثر مثال یہود ہی کے کسی گروہ کی ہو سکتی تھی۔

'وَلَهُمْ عَذَابٌ اَلِيْمٌ' یعنی دنیا میں تو وہ اس طرح کے کسی انجام سے دوچار ہوں گے اور آخرت میں ان کے لیے ایک دردناک عذاب ہے۔ یہ امر یہاں واضح رہے کہ بنو قریظہ دنیا میں بھی بنو نضیر کی نسبت کہیں زیادہ سخت انجام سے دوچار ہوئے اور آخرت میں ان کے سامنے جو کچھ آنے والا ہے اس کو اللہ تعالیٰ ہی جانتا ہے۔

كَمَثَلِ الشَّيْطٰنِ اِذْ قَالَ لِلْاِنْسَانِ اكْفُرْ ۚ فَلَمَّا كَفَرَ قَالَ اِنِّيْ بَرِيْٓءٌ مِّنْكَ اِنِّيْٓ اَخَافُ اللّٰهَ رَبَّ الْعٰلَمِيْنَ (۱۶)

منافقین کی مثال شیطان سے

یہ بنو قریظہ کو ابھارنے والے منافقین کی مثال بیان ہوئی ہے کہ یہ کہتے تو ہیں کہ آپ لوگ نکالے گئے

تو ہم بھی آپ کے ساتھ نکلیں گے اور اگر آپ لوگوں پر حملہ ہوا تو ہم آپ کا ساتھ دیں گے اور اس معاملے میں ہرگز کسی کا کوئی دباؤ نہیں قبول کریں گے لیکن یہ شیطان کے بھائی ہیں اور اسی کا رویہ اختیار کریں گے۔ جس طرح وہ انسان کو خدا کی نافرمانی کی راہ سجھاتا ہے اور جب آدمی اس کے چکمے میں آکر کوئی جرم کر بیٹھتا ہے تو وہ ناصح بن کر اس کو ملامت کرتا اور اس کا ساتھ چھوڑ دیتا ہے۔ اسی طرح یہ منافقین بھی آج تو ان لوگوں کی پیٹھ ٹھونک رہے ہیں لیکن جب یہ کوئی اقدام کر بیٹھیں گے اور اس کا انجام بد ان کے سامنے آئے گا تو پیٹھ ٹھونکنے والے شیاطین دم دبا کر بھاگیں گے اور ان کے نتائج کی ذمہ داری قبول کرنے پر ہرگز تیار نہیں ہوں گے۔

غزوۂ بدر میں یہود کی شرارت

سورۂ انفال آیت ۴۸ میں بسلسلۂ واقعات، غزوۂ بدر، بیان ہوا ہے کہ جب قریش اور مسلمانوں کی فوجیں آمنے سامنے ہوئیں تو پہلے تو شیطان نے کفار کو شہ دی کہ شاباش، بڑھ جاؤ لَا غَالِبَ لَكُمُ الْيَوْمَ مِنَ النَّاسِ وَإِنِّي جَارٌ لَّكُمْ (لوگوں میں کسی کی تاب نہیں کہ آج تم پر غالب آسکے، میں تمھاری پشت پر ہوں) لیکن جب دونوں فوجیں بھڑ گئیں اور فرشتوں کی کمک سے میدانِ جنگ کا نقشہ بالکل بدلا ہوا نظر آیا تو اس نے فوراً پینترا بدل کر پکارا کہ إِنِّي بَرِيءٌ مِّنكُمْ إِنِّي أَرَىٰ مَا لَا تَرَوْنَ إِنِّي أَخَافُ اللَّهَ وَاللَّهُ شَدِيدُ الْعِقَابِ (میں تمھارے اس اقدام کی ذمہ داری سے بری ہوں، میں وہ دیکھ رہا ہوں جو تم نہیں دیکھ رہے ہو۔ میں اللہ سے ڈرتا ہوں اور اللہ سخت پاداش والا ہے)۔

ہم نے سورۂ انفال کی تفسیر میں واضح کیا ہے کہ بدر کی جنگ یہود کی سازش سے پیش آئی تھی۔ انھی نے قریش کو ابھارا اور اس کا سارا نقشہ بنا کر ان کو دیا اور اپنی مدد کا بھی ان کو اطمینان دلایا لیکن جب اصل وقت آیا تو یہ شیطان کی طرح ان سے بری الذمہ ہو گئے۔

شیطان لیڈروں کا معروف طریقہ

قرآن مجید میں جگہ جگہ یہ بات واضح فرمائی گئی ہے کہ قیامت کے دن جب مجرمین اپنے جرم کی ذمہ داری اپنے شیطان لیڈروں پر ڈالنی چاہیں گے تو وہ صاف کہہ دیں گے کہ تم خود شامت زدہ تھے کہ تم نے ہماری پیروی کی۔ ہمیں تمھارے اوپر کوئی اختیار حاصل نہیں تھا کہ ہم تمھارے جرموں کے ذمہ دار ہوں۔ تم نے جو کچھ کیا خود کیا، اب اس کا خمیازہ بھگتو۔

اس دنیا میں بھی شیطان کے ایجنٹوں کا طریقۂ کار یہی ہے کہ وہ جرائم پر لوگوں کو ابھار تو دیتے ہیں لیکن جب ان کے نتائج سامنے آتے ہیں تو ان کی ذمہ داری سے اپنے کو بچانے کی کوشش کرتے ہیں۔

فَكَانَ عَاقِبَتَهُمَا أَنَّهُمَا فِي النَّارِ خَالِدَيْنِ فِيهَا ۚ وَذَٰلِكَ جَزَاءُ الظَّالِمِينَ (۱۷)

یعنی جرم کر گزرنے کے بعد اس طرح اپنے کو بچانے اور دوسرے کو متہم کرنے کی جو کوشش کی جاتی ہے اس کا فائدہ کسی فریق کو بھی نہیں پہنچتا بلکہ دونوں ہمیشہ ہمیشہ کے لیے جہنم میں پڑتے اور اپنی جانوں پر

---

[1] 'قَالَ' مختلف معنوں میں آتا ہے مثلاً کہنا، سجھانا، اشارہ کرنا، دعوت دینا، ابھارنا اور کسی اقدام پر آمادہ کرنا۔

ظلم ڈھانے والوں کا انجام یہی ہوا کرتا ہے۔

۶۔ آگے آیات ۱۸۔۲۴ کا مضمون

آگے خاتمۂ سورہ کی آیات ہیں جن میں خطاب اگرچہ لفظاً عام مسلمانوں سے ہے لیکن روئے سخن خاص طور پر منافقین ہی کی طرف ہے۔ ان کو متنبہ فرمایا گیا ہے کہ ہر شخص کے لیے سب سے زیادہ سنجیدگی کے ساتھ غور کرنے کا اصل مسئلہ یہ ہے کہ کل جو روزِ حساب آنے والا ہے اس کے لیے اس نے کیا کیا اور کیا کر رہا ہے۔ اللہ تعالیٰ ہر شخص کے ہر قول و فعل سے اچھی طرح باخبر ہے۔ وہ ہر ایک کو اس کے ایک ایک عمل کا بدلہ دے گا۔ ساتھ ہی ان کو آگاہ فرمایا گیا ہے کہ یہود کی طرح اللہ کو بھلا نہ بیٹھو۔ جو لوگ اللہ کو بھلا بیٹھتے ہیں وہ اللہ کا کچھ نہیں بگاڑتے بلکہ وہ خود اپنے ہی خیر و شر سے بالکل اندھے بن کے رہ جاتے ہیں۔ یاد رکھو کہ اہلِ دوزخ اور اہلِ جنت کے درمیان جو فرق ہوگا وہ کوئی معمولی فرق نہیں ہوگا کہ اس کو سہل انگاری سے نظر انداز کر دیا جائے بلکہ یہ بہت بڑا فرق ہوگا۔ فوز و فلاح صرف اہلِ جنت کو حاصل ہوگی۔ دوسروں کے لیے ابدی خسران کے سوا کچھ بھی نہیں ہے۔

پھر ان کو یہ آگاہی بھی دے دی گئی ہے کہ جہاں تک اتمامِ حجت کا تعلق ہے کوئی کسر نہیں چھوڑی گئی ہے کہ لوگ اللہ کے آگے کوئی عذر پیش کر سکیں۔ یہ قرآن، جو سنایا جا رہا ہے، ایسی چیز ہے کہ اگر یہ پہاڑ پر بھی اتارا جاتا تو وہ بھی، اپنی تمام سختی و صلابت کے باوجود، خشیتِ الٰہی سے شق ہو جاتا۔ جن کے دل اس سے متاثر نہیں ہو رہے ہیں وہ یاد رکھیں کہ یہ قرآن کا قصور نہیں ہے بلکہ یہ خود ان کے دلوں کی قساوت ہے کہ وہ اس سے پسیج نہیں رہے ہیں۔ اس طرح کے قسیّ القلب کسی چیز سے بھی متاثر ہونے والے نہیں ہیں۔

آخر میں اللہ تعالیٰ کی صفات کا آئینہ لوگوں کے سامنے رکھ دیا گیا ہے کہ وہ اس کے سامنے کھڑے ہو کر اپنے حاضر و مستقبل، اپنے خیر و شر، اپنے عقائد و اعمال اور اپنے مآل و انجام کا جائزہ لیں اور اپنے ظاہر و باطن کو اپنے رب کی صفات کے تقاضوں کے مطابق بنائیں اور سنواریں ورنہ وہ اپنے وجود کو اپنے لیے لعنت بنا لیں گے ـــــ اس روشنی میں آیات کی تلاوت فرمائیے۔

آیات ۱۸-۲۴

يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوا اتَّقُوا اللّٰهَ وَلْتَنْظُرْ نَفْسٌ مَّا قَدَّمَتْ لِغَدٍ ۚ وَاتَّقُوا اللّٰهَ ۭ اِنَّ اللّٰهَ خَبِيْرٌۢ بِمَا تَعْمَلُوْنَ ﴿۱۸﴾ وَلَا تَكُوْنُوْا كَالَّذِيْنَ نَسُوا اللّٰهَ فَاَنْسٰىهُمْ اَنْفُسَهُمْ ۭ اُولٰۗىِٕكَ هُمُ

الْفٰسِقُوْنَ ﴿۱۹﴾ لَا يَسْتَوِيْٓ اَصْحٰبُ النَّارِ وَاَصْحٰبُ الْجَنَّةِ ؕ اَصْحٰبُ الْجَنَّةِ هُمُ الْفَآئِزُوْنَ ﴿۲۰﴾ لَوْ اَنْزَلْنَا هٰذَا الْقُرْاٰنَ عَلٰى جَبَلٍ لَّرَاَيْتَهٗ خَاشِعًا مُّتَصَدِّعًا مِّنْ خَشْيَةِ اللّٰهِ ؕ وَ تِلْكَ الْاَمْثَالُ نَضْرِبُهَا لِلنَّاسِ لَعَلَّهُمْ يَتَفَكَّرُوْنَ ﴿۲۱﴾ هُوَ اللّٰهُ الَّذِيْ لَآ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ ۚ عٰلِمُ الْغَيْبِ وَالشَّهَادَةِ ۚ هُوَ الرَّحْمٰنُ الرَّحِيْمُ ﴿۲۲﴾ هُوَ اللّٰهُ الَّذِيْ لَآ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ ۚ اَلْمَلِكُ الْقُدُّوْسُ السَّلٰمُ الْمُؤْمِنُ الْمُهَيْمِنُ الْعَزِيْزُ الْجَبَّارُ الْمُتَكَبِّرُ ؕ سُبْحٰنَ اللّٰهِ عَمَّا يُشْرِكُوْنَ ﴿۲۳﴾ هُوَ اللّٰهُ الْخَالِقُ الْبَارِئُ الْمُصَوِّرُ لَهُ الْاَسْمَآءُ الْحُسْنٰى ؕ يُسَبِّحُ لَهٗ مَا فِي السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ ۚ وَهُوَ الْعَزِيْزُ الْحَكِيْمُ ﴿۲۴﴾ ع ۳ ۶

ترجمہ آیات ۱۸-۲۴

اے ایمان والو، اللہ سے ڈرو اور چاہیے کہ ہر نفس اچھی طرح جائزہ لے رکھے اس کا جو اس نے کل کے لیے کیا ہے۔ اور اللہ سے ڈرتے رہو، بے شک اللہ اس سے اچھی طرح باخبر ہے جو تم کرتے ہو۔ اور تم ان لوگوں کی طرح نہ بن جاؤ جو اللہ کو بھول بیٹھے تو اللہ نے ان کو خود ان کی جانوں سے غافل کر دیا۔ یہی لوگ اصلی نافرمان ہیں۔ ۱۸-۱۹

دوزخ میں پڑنے والے اور جنت میں جانے والے یکساں نہیں ہوں گے۔ جنت والے ہی کامیاب ہونے والے بنیں گے۔ ۲۰

اگر اس قرآن کو ہم کسی پہاڑ پر اتارتے تو تم دیکھتے کہ وہ خشیت الٰہی سے پست

اور پاش پاش ہو جاتا اور یہ مثالیں ہم لوگوں کے لیے بیان کرتے ہیں تاکہ وہ سوچیں۔ ۲۱

وہی اللہ ہے جس کے سوا کوئی معبود نہیں، غائب و حاضر کا جاننے والا، وہ رحمان و رحیم ہے۔ ۲۲

وہی اللہ ہے جس کے سوا کوئی معبود نہیں۔ بادشاہ، یکسر پاک، سراپا سُکھ، امن بخش، معتمد، غالب، زورآور، صاحبِ کبریائی۔ اللہ پاک ہے ان چیزوں سے جن کو لوگ اس کا شریک ٹھہراتے ہیں۔ ۲۳

وہی اللہ ہے نقشہ بنانے والا، وجود میں لانے والا، صورت گری کرنے والا۔ اسی کے لیے ساری اچھی صفتیں ہیں۔ اسی کی تسبیح کرتی ہیں جو چیزیں آسمانوں اور زمین میں ہیں۔ اور وہ غالب و حکیم ہے۔ ۲۴

۷۔ الفاظ کی تحقیق اور آیات کی وضاحت

يَٰٓأَيُّهَا ٱلَّذِينَ ءَامَنُوا۟ ٱتَّقُوا۟ ٱللَّهَ وَلْتَنظُرْ نَفْسٌ مَّا قَدَّمَتْ لِغَدٍ ۖ وَٱتَّقُوا۟ ٱللَّهَ ۚ إِنَّ ٱللَّهَ خَبِيرٌۢ بِمَا تَعْمَلُونَ (۱۸)

روزِ حساب کی یاد دہانی

خطاب، باعتبارِ الفاظ، اگرچہ عام مسلمانوں سے ہے لیکن موقع و محل بتا رہا ہے کہ روئے سخن اصلاً ان منافقین ہی کی طرف ہے جن کی کمزوریاں اس سورہ میں شروع سے زیرِ بحث ہیں۔ آخر کو آخر میں گویا اُس حقیقت الحقائق کی طرف توجہ دلائی جا رہی ہے جس سے غفلت نفس کی تمام بیماریوں کی جڑ اور جس کی یاد داشت ہی انسان کی تمام عقلی و روحانی اور اخلاقی بیماریوں کا واحد علاج ہے۔ فرمایا کہ اے لوگو، جو ایمان لائے ہو، تمہارے ایمان کا لازمی تقاضا یہ ہے کہ اپنے رب سے ڈرتے اور اپنے اعمال کا برابر جائزہ لیتے رہو کہ کل جو روزِ حساب آنے والا ہے اس کے لیے تم نے کیا تیاری کی ہے۔ ڈرتے رہنے کی تاکید اس لیے فرمائی کہ کوئی اس غلط فہمی میں نہ پڑا رہے کہ یہ دنیا کوئی کھیل تماشا ہے جو یوں ہی ختم ہو جائے گا۔ یہ یوں ہی نہیں ختم ہو گا بلکہ اس کے بعد جزا و سزا بھی ہے جو لازمی ہے۔ روزِ قیامت کو لفظ 'غد' سے تعبیر فرمایا ہے جس سے مقصود اس کے قرب اور اس کی قطعیت

کی طرف اشارہ کرنا ہے کہ اپنے اعمال کا محاسبہ کرنے میں دفع الوقتی سے کام نہ لو کہ ابھی بہت دن پڑے ہیں، جب وقت قریب آجائے گا تو دیکھ لیں گے۔ وہ دن دُور نہیں ہے۔ جس طرح آج کے بعد کل ہے اسی طرح اس کو بھی آیا ہی سمجھو۔

'وَاتَّقُوا اللّٰهَ اِنَّ اللّٰهَ خَبِيْرٌۢ بِمَا تَعْمَلُوْنَ'۔ معاملہ کی اہمیت کی طرف متوجہ کرنے کے لیے 'اِتَّقُوا اللّٰهَ'، کو پھر دہرایا اور اس کے بعد اس حقیقت کی یاد دہانی فرمائی کہ اس غلط فہمی میں نہ رہو کہ خدا تمھارے کسی عمل سے بے خبر ہے۔ وہ تمھارے ایک ایک قول و فعل سے واقف ہے اس وجہ سے سلامتی اسی میں ہے کہ جو کچھ کرو یہ پیشِ نظر رکھ کر کرو کہ تمھارا یہ عمل خدا کے علم میں رہے گا اور ایک دن تمھیں اس کی جزا یا سزا ملنی ہے۔

وَلَا تَكُوْنُوْا كَالَّذِيْنَ نَسُوا اللّٰهَ فَاَنْسٰىهُمْ اَنْفُسَهُمْ ؕ اُولٰٓئِكَ هُمُ الْفٰسِقُوْنَ (۱۹)

فرمایا کہ ان لوگوں کی طرح نہ بن جاؤ جنھوں نے خدا کو بھلا دیا تو خدا نے ان کو خود ان کے انجام سے غافل کر دیا۔ 'كَالَّذِيْنَ نَسُوا اللّٰهَ' سے اشارہ یہود کی طرف ہے۔ یہود ہی ان منافقین کے مرشد تھے۔ قرآن نے ان کو آگاہ فرمایا کہ ان لوگوں کی طرح اگر تم بھی خدا کو بھلا بیٹھے تو یاد رکھو کہ خدا کا کچھ نہیں بگاڑو گے بلکہ اپنے ہی کو تباہ کرو گے۔

جو خدا کو بھلا دیتے ہیں وہ خود اپنے کو بھلا دیتے ہیں

'فَاَنْسٰىهُمْ اَنْفُسَهُمْ' میں ایک بڑی اہم حقیقت کی طرف توجہ دلائی گئی ہے کہ جو لوگ خدا کو بھلا دیتے ہیں اس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ وہ خود اپنے خیر و شر اور اپنی عاقبت سے بالکل بے پروا ہو جاتے ہیں۔ زندگی کی ساری قدر و قیمت اور اس کا سارا شرف و جمال اس حقیقت کے سمجھنے پر منحصر ہے کہ خالق نے اس کو محض چند روزہ عیشِ دنیا کے لیے نہیں بنایا ہے بلکہ اس لیے بنایا ہے کہ انسان اس کو خدا کے احکام کے تحت گزار کر اپنے کو ابدی بادشاہی کا سزاوار بنائے۔ یہ معراج ظاہر ہے کہ اسی کو حاصل ہو گی جو ہمیشہ اس حقیقت کو یاد رکھے کہ یہ زندگی اس کو اتفاقیہ نہیں مل گئی ہے بلکہ ایک بخشنے والے کی بخشی ہوئی ہے اور اس نے ایک خاص مقصد سے یہ اس کو بخشی ہے۔ اگر اس مقصد کے تحت میں اس کو گزاروں گا تب تو یہ عظیم ابدی نعمت ہے اور اگر اس مقصد کو بھلا بیٹھا تو یہ آپ سے آپ ایک ابدی لعنت بن جائے گی۔

'اُولٰٓئِكَ هُمُ الْفٰسِقُوْنَ'۔ فرمایا کہ خدا کے اصل نافرمان یہی لوگ ہیں۔ انھوں نے خدا کو بھلایا تو خدا کے ساتھ اپنی زندگی کے تعلق کی نوعیت بھی بھول بیٹھے جس کا نتیجہ یہ نکلا کہ وہ خدا کے بالکل ہی نافرمان بن گئے۔

اس سے خدا کی یاد کی حقیقت بھی واضح ہوئی کہ اس کی اصل روح یہ ہے کہ آدمی اس تعلق کی نوعیت کو ہمیشہ اپنے سامنے مستحضر رکھے جو اس کے اور اس کے رب کے مابین ہے۔ اسی کے استحضار سے

یہ یادِ زندگی پر اثر انداز ہوتی ہے۔ اگر یہ چیز نہ ہو تو یہ یاد کچھ نتیجہ خیز نہیں ہوتی بلکہ یہ بالکل رسمی سی چیز بن کے رہ جاتی ہے جس کا ہونا نہ ہونا دونوں یکساں ہوتا ہے۔

لَا یَسْتَوِیْٓ اَصْحٰبُ النَّارِ وَاَصْحٰبُ الْجَنَّةِ ؕ اَصْحٰبُ الْجَنَّةِ هُمُ الْفَآئِزُوْنَ (۲۰)

ایک نہایت اہم حقیقت

یہ ایک اور نہایت اہم حقیقت کی طرف توجہ دلائی ہے جس کو پیشِ نظر رکھنا زندگی کی حقیقی قدر و قیمت سمجھنے کے لیے ضروری ہے۔ وہ یہ کہ اہلِ جنت اور اہلِ دوزخ کے درمیان جو فرق ہوگا وہ ایسا نہیں ہے کہ اس کو اہمیت نہ دی جائے۔ آج خواہشاتِ نفس سے مغلوب ہو کر اگر کوئی جنت اور دوزخ کے تفاوت کو محسوس نہیں کر رہا ہے تو اس کو یہ بات یاد رکھنی چاہیے کہ دونوں میں صرف ڈگری کا فرق نہیں ہے کہ کسی نہ کسی درجے میں اہلِ دوزخ کی زندگی پر بھی قناعت کی جا سکے۔ بلکہ دونوں کے درمیان ابدی نعمت اور ابدی زحمت کا فرق ہوگا۔ فوز و فلاح صرف اہلِ جنت کے لیے خاص ہوگی۔ اہلِ دوزخ کے لیے لعنت اور عذاب کے سوا کچھ بھی نہیں ہے۔

لَوْ اَنْزَلْنَا هٰذَا الْقُرْاٰنَ عَلٰی جَبَلٍ لَّرَاَیْتَهٗ خَاشِعًا مُّتَصَدِّعًا مِّنْ خَشْیَةِ اللّٰهِ ؕ وَتِلْكَ الْاَمْثَالُ نَضْرِبُهَا لِلنَّاسِ لَعَلَّهُمْ یَتَفَكَّرُوْنَ (۲۱)

ایک بلیغ تمثیل

یہ ان منافقین کو زجر و ملامت ہے کہ جہاں تک تعلیم و تذکیر اور اتمامِ حجت کا تعلق ہے اللہ نے تمہارے لیے کوئی کسر نہیں چھوڑی ہے۔ یہ قرآن ایسی چیز ہے کہ اگر پہاڑ جیسی سخت اور بے حس چیز پر بھی اتارا جاتا تو وہ بھی خشیتِ الٰہی سے سرفگندہ اور ریزہ ریزہ ہو جاتا لیکن تم ایسے سنگ دل اور بے حس ہو کہ تمہارے دل ذرا بھی اس سے متاثر نہیں ہو رہے ہیں۔

'وَتِلْكَ الْاَمْثَالُ نَضْرِبُهَا لِلنَّاسِ لَعَلَّهُمْ یَتَفَكَّرُوْنَ'۔ فرمایا کہ یہ تمثیلیں ہم اس لیے بیان کر رہے ہیں کہ لوگ اپنے حال پر غور کریں کہ اگر ایسی مؤثر چیز بھی ان کے دلوں پر اثر انداز نہیں ہو رہی ہے تو اس میں قصور اس شے کا نہیں بلکہ صرف ان کے دلوں کی قساوت کا ہے اور پھر وہ اس معاملے پر بھی غور کریں کہ جب ان کے دلوں کی قساوت اس درجہ بڑھ گئی ہے تو ایسا نہ ہو کہ اللہ تعالیٰ اپنی سنّت کے مطابق ان کے دلوں پر بھی اسی طرح مہر کر دے جس طرح اس نے یہود کے دلوں پر کر دی۔

یہ مضمون، مختلف اسلوبوں سے، قرآن کے دوسرے مقامات میں بھی بیان ہوا ہے۔ ہم بعض مثالیں پیش کرتے ہیں تاکہ اس کا اصل رخ نگاہوں کے سامنے آ جائے۔ سورۂ بقرہ میں یہود کے متعلق فرمایا ہے:

ثُمَّ قَسَتْ قُلُوْبُكُمْ مِّنْۢ بَعْدِ	پھر اس کے بعد تمہارے دل سخت ہو کر پتھر کے
ذٰلِكَ فَهِیَ كَالْحِجَارَةِ اَوْ اَشَدُّ	مانند بن گئے بلکہ اس سے بھی سخت۔ اور پتھروں
قَسْوَةً ؕ وَاِنَّ مِنَ الْحِجَارَةِ	میں سے تو بعض ایسے بھی ہیں جن سے نہریں

لَمَا يَتَفَجَّرُ مِنْهُ الْاَنْهٰرُ ؕ وَ اِنَّ	پھوٹ پڑتی ہیں اور بعض ایسے ہیں جو پھٹ جاتے
مِنْهَا لَمَا يَشَّقَّقُ فَيَخْرُجُ مِنْهُ الْمَآءُ ؕ	ہیں اور ان سے پانی جاری ہو جاتا ہے اور ان
وَ اِنَّ مِنْهَا لَمَا يَهْبِطُ مِنْ خَشْيَةِ	میں سے ایسے بھی ہیں جو اللہ کی خشیت سے گر پڑتے
اللّٰهِ ؕ وَ مَا اللّٰهُ بِغَافِلٍ عَمَّا	ہیں اور تم جو کچھ کرتے ہو اللہ اس سے غافل
تَعْمَلُوْنَ ۝ (البقرۃ - ۲: ۷۴)	نہیں ہے۔

اسی طرح سورۂ حدید میں انہی منافقین سے متعلق فرمایا ہے جن سے یہاں بحث ہے:

اَلَمْ يَاْنِ لِلَّذِيْنَ اٰمَنُوْٓا اَنْ	کیا ان لوگوں کے لیے جو ایمان لائے ابھی وقت
تَخْشَعَ قُلُوْبُهُمْ لِذِكْرِ اللّٰهِ وَ مَا	نہیں آیا کہ اللہ کی یاد دہانی اور جو حق نازل ہوا
نَزَلَ مِنَ الْحَقِّ ۙ وَ لَا يَكُوْنُوْا	ہے اس کے آگے ان کے دل جھک پڑیں اور وہ
كَالَّذِيْنَ اُوْتُوا الْكِتٰبَ مِنْ قَبْلُ	ان لوگوں کی طرح ہو کے نہ رہ جائیں جن کو اس سے
فَطَالَ عَلَيْهِمُ الْاَمَدُ فَقَسَتْ	پہلے کتاب دی گئی تو ان پر ایک مدت گزر گئی
قُلُوْبُهُمْ ؕ وَ كَثِيْرٌ مِّنْهُمْ	اور ان کے دل سخت ہو کے رہ گئے اور ان میں
فٰسِقُوْنَ (الحدید - ۵۷: ۱۶)	بہتیرے نافرمان ہیں۔

استاذ امام رحمۃ اللہ علیہ کے بعض اشارات سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ اس آیت کو اِنَّا عَرَضْنَا الْاَمَانَةَ عَلَى السَّمٰوٰتِ وَ الْاَرْضِ وَ الْجِبَالِ فَاَبَيْنَ اَنْ يَّحْمِلْنَهَا وَ اَشْفَقْنَ مِنْهَا وَ حَمَلَهَا الْاِنْسَانُ ؕ اِنَّهٗ كَانَ ظَلُوْمًا جَهُوْلًا (الاحزاب - ۳۳: ۷۲) (اور ہم نے اپنی امانت آسمانوں اور زمین اور پہاڑوں کے سامنے پیش کی تو انھوں نے اس کے اٹھانے سے انکار کیا اور اس سے ڈرے اور انسان نے اس کو اٹھا لیا۔ بے شک وہ ظلم کرنے والا اور جذبات سے مغلوب ہو جانے والا ہے) کی روشنی میں لیتے ہیں۔ اس میں شبہ نہیں کہ اسی کے ایک پہلو کی وضاحت اس کی روشنی میں بھی ہوتی ہے لیکن البقرۃ اور الحدید کی مذکورہ بالا آیات سے اس کا ہر پہلو واضح ہو جاتا ہے۔

قرآن نے اس کو تمثیل سے تعبیر فرمایا ہے۔ تمثیل میں مبالغہ یا تخییل کا کوئی سوال نہیں پیدا ہوتا بلکہ صرف یہ دیکھا جاتا ہے کہ ایک معنوی حقیقت ایک مادی پیرایۂ بیان میں متمثل ہو کر سامنے آ گئی یا نہیں۔ اس پہلو سے دیکھیے تو معلوم ہوگا کہ یہ تمثیل ایک نہایت ہی اعلیٰ اور بلیغ تمثیل ہے۔

'لَرَاَيْتَهٗ' میں خطاب عام بھی ہو سکتا ہے لیکن اس کا مخاطب اگر نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو مانیے تو اس آیت کے اندر حضورؐ کے لیے بہت بڑی تسلی بھی ہے کہ اگر تمھاری دعوت سے یہ لوگ متاثر نہیں ہو رہے ہیں تو اس میں تمھارا کوئی قصور نہیں ہے۔ جو قرآن تم ان کو سنا رہے ہو یہ تو وہ چیز ہے

کہ اگر کسی پہاڑ پر بھی اتارا جاتا تو وہ بھی اللہ کی خشیت سے سرنگوں اور دونیم ہو جاتا لیکن ان لوگوں کے دل پتھر سے بھی زیادہ سخت ہیں کہ وہ اس سے کوئی اثر نہیں لے رہے ہیں۔

هُوَ اللّٰهُ الَّذِیْ لَاۤ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ ۚ عٰلِمُ الْغَیْبِ وَالشَّهَادَةِ ۚ هُوَ الرَّحْمٰنُ الرَّحِیْمُ (۲۲)

صفاتِ الٰہی کا حوالہ

اوپر کی آیت میں جب اللہ تعالیٰ کی خشیت کا ذکر آیا تو اس آیت میں اور آگے کی آیات میں اس کے وہ اسمائے حسنیٰ بیان کر دیے گئے جن کی حیثیت بنیادی اسما کی ہے تاکہ مومنین، کفار اور منافقین سب کو معلوم ہو جائے کہ جس رب سے ان کو ڈرایا جا رہا ہے وہ کن اوصاف کا مالک ہے! انھیں کس طرح اس سے ڈرنا چاہیے، کس قدر اس سے محبت کرنی چاہیے، کس طرح اس سے امید کرنی چاہیے، کس طرح اس پر بھروسہ کرنا چاہیے اور کس طرح اسی کے لیے جینا اور اسی کی راہ میں مرنا چاہیے۔ فلسفۂ دین کی یہ حقیقت ہم اس کتاب میں جگہ جگہ واضح کرتے آ رہے ہیں کہ تمام دین و شریعت کی بنیاد درحقیقت اللہ تعالیٰ کی صفات اور ان کے مقتضیات ہی پر ہے۔ قرآن میں 'اَلْحَمْدُ' سے لے کر 'وَالنَّاسِ' تک جو کچھ بیان ہوا ہے وہ تمام تر صفاتِ الٰہی کے مظاہر و انوار اور ان کے تقاضوں ہی کا بیان ہے۔ انہی سے دین کا فلسفہ وجود میں آیا ہے اور انہی سے دین کے مظاہر و اشکال بھی ظہور پذیر ہوئے ہیں اس وجہ سے ان کا سمجھنا ضروری ہے لیکن ان کو سمجھنے کے لیے پورے قرآن کو سمجھنا ضروری ہے۔ یہاں ہم بالاجمال صرف ان پہلوؤں کی طرف اشارہ کریں گے جن سے ان صفات کے ابتدائی تقاضوں کے سمجھنے میں مدد ملے۔

'هُوَ اللّٰهُ الَّذِیْ لَاۤ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ'۔ سب سے پہلے اپنی الوہیت کی یاددہانی فرمائی اور ساتھ ہی اس بات کی کہ اس کے سوا کوئی اور معبود نہیں ہے اس وجہ سے امید و بیم دونوں حالتوں میں بندوں کو اسی سے رجوع کرنا چاہیے۔ اس کے سوا کوئی اور حق دار نہیں ہے کہ اس کو معبود مانا جائے یا اس کی پرستش کی جائے یا اس کو مرجع سمجھ کر اس سے امیدیں وابستہ کی جائیں۔

'عٰلِمُ الْغَیْبِ وَالشَّهَادَةِ'۔ وہ غائب و حاضر دونوں کو جاننے والا ہے۔ لفظ 'غیب' یہاں بندوں کے لحاظ سے استعمال ہوا ہے ورنہ اللہ تعالیٰ کے لیے ہر چیز شہادت (حاضر) کے حکم میں داخل ہے۔ اس صفت کے اندر امید و بیم دونوں کے پہلو ہیں۔ بیم کا پہلو یہ ہے کہ انسان جو کچھ بھی کرتا ہے، خواہ سرًّا یا علانیۃً، وہ اللہ کے علم میں ہے اور جب سب کچھ اس کے علم میں ہے تو وہ لازمًا ایک ایک چیز سے متعلق باز پرس کرے گا۔ پھر نہ تو کوئی اپنے کسی قول و فعل کو چھپا سکے گا اور نہ اس کا کوئی سفارشی خدا کے سامنے اس کے باب میں کوئی غلط بیانی کر سکے گا۔ امید کا پہلو اس میں یہ ہے کہ جب اس کا رب اس کے ہر غائب و حاضر سے واقف ہے تو اس کو اس پر پورا بھروسہ رکھنا

چاہیے اور اپنی ہر درخواست اسی کے آگے پیش کرنی چاہیے۔

هُوَ الرَّحْمٰنُ الرَّحِيْمُ: رَحْمٰن اور رَحِيْم کے فرق پر آیت بِسْمِ اللّٰہِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ کے تحت ہم بحث کر چکے ہیں۔ صفت رَحْمٰن کے اندر رحمت کے جوش کا اور رَحِيْم کے اندر رحمت کی پائداری کا مفہوم پایا جاتا ہے۔ ان صفات کے اندر بھی غور کیجیے تو معلوم ہوگا کہ امید و بیم دونوں کے پہلو موجود ہیں۔ امید کا پہلو تو واضح ہے کہ جب خدا رحمان بھی ہے اور رحیم بھی تو اس سے کسی ظلم یا ناانصافی کا کوئی اندیشہ نہیں ہو سکتا کہ اس کے ہاں کسی سفارشی کی ضرورت پیش آئے۔ اس نے جو کچھ کیا ہے اور جو کچھ کرے گا رحمت ہی کے لیے کیا ہے اور رحمت ہی کے لیے کرے گا، دنیا میں بھی اور آخرت میں بھی۔ بیم کا پہلو اس میں یہ ہے کہ جب خدا رحمان اور رحیم ہے تو وہ کسی کے ظلم کو گوارا نہیں کرے گا بلکہ ہر شخص کے ظلم کا لازماً بدلہ لے گا۔ چنانچہ یہی وجہ ہے کہ اس نے قرآن میں جگہ جگہ قیامت کو اپنی صفت رحمت ہی پر مبنی کیا ہے کہ یہ اس کی رحمت کا لازمی تقاضا ہے کہ وہ قیامت لائے تاکہ ہر ایک کے ساتھ پورا پورا انصاف کرے۔ كَتَبَ عَلٰى نَفْسِهِ الرَّحْمَةَ ۚ لَيَجْمَعَنَّكُمْ اِلٰى يَوْمِ الْقِيٰمَةِ (الانعام-۶:۱۲)

هُوَ اللّٰهُ الَّذِيْ لَآ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ ۚ اَلْمَلِكُ الْقُدُّوْسُ السَّلٰمُ الْمُؤْمِنُ الْمُهَيْمِنُ الْعَزِيْزُ الْجَبَّارُ الْمُتَكَبِّرُ ۭ سُبْحٰنَ اللّٰهِ عَمَّا يُشْرِكُوْنَ (۲۳)

اس آیت میں پہلے تو اسی ٹکڑے کا اعادہ ہے جو اوپر والی آیت میں گزرا جس سے معلوم ہوا کہ شرک کی نفی اور توحید کا اثبات یہاں سب سے زیادہ اہمیت کے ساتھ مدنظر ہے۔ اس کی وجہ ظاہر ہے کہ خدا کی صفات کے باب میں ساری گمراہی شرک ہی سے پیدا ہوتی ہے اور جب ان صفات ہی پر، جیسا کہ ہم نے اوپر عرض کیا، تمام دین و شریعت کی بنیاد ہے، تو ضروری ہوا کہ اس بنیاد میں کجی کے ہر امکان کا سدّباب کر دیا جائے۔

اس کے بعد اللہ تعالیٰ کے اسمائے حسنیٰ میں سے آٹھ اسماء اتصال کے ساتھ بیان ہوئے ہیں یعنی ان کے درمیان کوئی حرفِ عطف نہیں ہے۔ ہم عربیت کے اس قاعدے کی وضاحت اس کے محل میں کر چکے ہیں کہ جب صفات اس طرح بغیر حرفِ عطف کے آئیں تو اس کے معنی یہ ہوتے ہیں کہ یہ تمام صفات موصوف میں بیک وقت پائی جاتی ہیں۔

اَلْمَلِكُ: یعنی وہ بادشاہ ہے۔ اسی نے یہ دنیا پیدا کی ہے اور وہی بلا شرکتِ غیرے اس کا مالک اور حکمران ہے۔ چنانچہ اس نے اپنے اسی حق کی بنا پر اپنے رسول بھیجے تاکہ وہ اس کے بندوں کو اس کے احکام سے آگاہ کریں اور بندے ان کی تعمیل کر کے اپنے بادشاہِ حقیقی کی خوشنودی حاصل کریں۔

اَلْقُدُّوْسُ: وہ ہر عیب، ہر نقص اور ہر برائی و خرابی سے بالکل پاک و منزّہ ہے اس وجہ سے اس نے اپنے بندوں کو پاکیزہ بنانے کے لیے کتاب اتاری اور رسول بھیجے تاکہ بندے پاکیزہ بن کر اس کا قرب

حاصل کرنے کے اہل بن سکیں۔ سورۂ جمعہ میں 'ملک' اور 'قدوس' دونوں صفتوں کا حوالہ دے کر ان کا مقتضیٰ واضح فرمادیا ہے۔ پہلے اپنی صفات کا حوالہ ان الفاظ میں دیا: اَلْمَلِكِ الْقُدُّوْسِ الْعَزِيْزِ الْحَكِيْمِ (۱) اس کے بعد اپنی ان صفات کا مقتضیٰ اس طرح واضح فرمایا: هُوَ الَّذِيْ بَعَثَ فِي الْاُمِّيّٖنَ رَسُوْلًا مِّنْهُمْ يَتْلُوْا عَلَيْهِمْ اٰيٰتِهٖ وَيُزَكِّيْهِمْ (۲) (وہی ہے جس نے اٹھایا امیوں میں ایک رسول انہی میں سے جو اس کی آیتوں کی تلاوت اور ان کا تزکیہ کرتا ہے) غور کیجیے تو معلوم ہوگا کہ رسول اور کتاب تو اس نے اسے لیے بھیجے کہ وہ بادشاہ ہے، اس کے بادشاہ ہونے کا یہ لازمی تقاضا ہے کہ وہ اپنی رعیت کے پاس اپنے سفیر بھی بھیجے اور اپنے احکام بھی اور اپنے بندوں کا تزکیہ اس وجہ سے اس نے چاہا کہ وہ قدوس اور پاک ہے۔ وہ یہ نہیں پسند کر سکتا کہ اس کے بندے گناہوں میں آلودہ رہیں۔ آگے 'عزیز' اور 'حکیم' کی صفتوں کے تقاضے بھی بیان ہوئے ہیں جن کی وضاحت ان کے محل میں ان شاء اللہ آئے گی۔

'اَلسَّلٰمُ' کے معنی سلامتی، سکھ اور چین کے ہیں۔ کسی کو سلامتی کی دعا دینی ہو تو ہم یہی لفظ استعمال کرتے ہیں۔ قرآن میں لیلۃ القدر کے متعلق فرمایا ہے: سَلٰمٌ هِيَ حَتّٰى مَطْلَعِ الْفَجْرِ (القدر-۹۷: ۵) (اس میں سلامتی ہی سلامتی ہے، وہ طلوع فجر تک ہے) یعنی اللہ تعالیٰ اپنے بندوں کے لیے ہر آفت اور ہر خطرے سے امان اور سپر ہے۔ بندہ جب اپنے کو اس کی پناہ میں دے دیتا ہے تو وہ سکھ اور چین پاتا ہے۔ اس کی اسی صفت کا فیض ہے کہ اس کی یاد دلوں کو سکینت و طمانیت بخشتی ہے۔ اَلَا بِذِكْرِ اللّٰهِ تَطْمَئِنُّ الْقُلُوْبُ (الرعد-۱۳: ۲۸) (سن لو کہ اللہ ہی کی یاد سے دلوں کو طمانیت حاصل ہوتی ہے)۔

'اَلْمُؤْمِنُ' کے معنی ہیں امان دینے والا یعنی شیطان اور اس کے ایجنٹوں کے حملوں سے بچنے کے لیے جب بندہ اس کی پناہ ڈھونڈتا ہے تو وہ اس کو اپنی پناہ میں لے لیتا ہے۔ یہ پناہ اس کے سوا اور کہیں بھی بندے کو حاصل نہیں ہو سکتی۔ شیطان کی رسائی خدا کے دامن کے سوا ہر جگہ ہے۔

'اَلْمُهَيْمِنُ' کے معنی خلیل اور ابو عبیدہ کے نزدیک نگران کے ہیں۔ ابن الانباری کے نزدیک القائم علی الناس یعنی لوگوں کے محافظ کے ہیں۔ امام فراہی رحمۃ اللہ علیہ کے نزدیک اس کے معنی معتمد اور وکیل کے ہیں۔ میرے نزدیک ان معانی میں کوئی خاص فرق نہیں ہے۔ جو محافظ و نگران ہوتا ہے وہی درحقیقت معتمد اور وکیل ہوتا ہے۔ قرآن بھی 'مُهَيْمِن' ہے اس لیے کہ تمام آسمانی صحیفوں کے لیے قابلِ اعتماد کسوٹی وہی ہے۔

'اَلْعَزِيْزُ' کی وضاحت جگہ جگہ ہو چکی ہے۔ اس کے اندر رسائی سے بالاتر اور دست رسی سے مافوق ہونے کا مفہوم بھی ہے اور غالب و قوی ہونے کا بھی یعنی اس پر کوئی حاوی نہیں ہو سکتا،

وہ سب کو شکست دے سکتا ہے۔

'اَلْجَبَّارُ' کے معنی زور آور اور تگڑے کے ہیں۔ عربی میں یہ لفظ کھجور کے ان درختوں کے لیے بھی آتا ہے جو غیر معمولی طور پر اونچے ہوں۔ قرآن میں یہ ان زور آوروں کے لیے بھی آیا ہے جن سے ڈر کر بنی اسرائیل نے حضرت موسیٰ علیہ السلام سے فریاد کی تھی کہ اِنَّ فِیْھَا قَوْمًا جَبَّارِیْنَ وَاِنَّا لَنْ نَّدْخُلَھَا حَتّٰی یَخْرُجُوْا مِنْھَا (المآئدۃ ۵ : ۲۲) (اس بستی میں بڑے ہی زور آور اور تگڑے لوگ ہیں، جب تک وہ اس میں ہیں، ہم اس میں داخل ہونے کا حوصلہ نہیں کر سکتے)۔ یہ صفت ان تمام تصورات الوہیت کی نفی کرتی ہے جن میں ساری اہمیت دیویوں کو دی گئی ہے۔

'اَلْمُتَکَبِّرُ' کے معنی ہیں اپنی بڑائی اور برتری کا احساس رکھنے والا۔ یہ احساس اللہ تعالیٰ کے سوا کسی اور کے اندر ہو تو باطل ہے اس لیے کہ اللہ تعالیٰ کے سوا کسی کو بھی کوئی ایسی بڑائی حاصل نہیں ہے جو اس کی ذاتی ہو بلکہ جس کو بھی کوئی بڑائی حاصل ہے وہ اللہ ہی کی بخشی ہوئی ہے۔ البتہ اللہ تعالیٰ کے لیے تکبّر زیبا اور برحق ہے اس لیے کہ اس کی بڑائی ذاتی اور ازلی و ابدی ہے۔ اس کے اس احساس ہی کا یہ اثر ہے کہ وہ اپنی خدائی اور بادشاہی میں کسی کی شرکت گوارا نہیں کرتا۔ اللہ تعالیٰ کے اس شعور کی تعبیر دوسرے آسمانی صحیفوں میں یوں کی گئی ہے کہ 'تمھارا خداوند خدا غیور ہے، جس طرح تم یہ گوارا نہیں کرتے کہ تمھاری بیوی کسی غیر کی بغل میں سوئے اسی طرح وہ بھی گوارا نہیں کرتا کہ اس کا بندہ کسی غیر کی بندگی کرے'۔ میرے نزدیک قرآن نے جو مضمون لفظ 'متکبّر' سے ادا کیا ہے دوسرے آسمانی صحیفوں میں وہی مضمون 'غیور' سے ادا کیا گیا ہے۔

'سُبْحٰنَ اللّٰہِ عَمَّا یُشْرِکُوْنَ' یعنی کہاں اللہ تعالیٰ کی یہ صفاتِ جمال و کمال اور کہاں ان مشرکوں کے یہ فرضی دیوی دیوتا! دونوں میں کیا نسبت!! جو خدا ان صفات سے متّصف ہے، وہ اس سے ارفع ہے کہ اس کے ساتھ اس طرح کی چیزوں کا جوڑ ملایا جائے۔ اگر اس طرح کا کوئی جوڑ اس کے ساتھ ملایا جائے گا تو اس کی دوسری بنیادی صفات اس کو قبول کرنے سے اِبا کریں گی اور اگر زبردستی اس کو چپکانے کی کوشش کی گئی تو اس کی صفات میں بے ربطی پیدا ہو جائے گی۔

ھُوَ اللّٰہُ الْخَالِقُ الْبَارِئُ الْمُصَوِّرُ لَہُ الْاَسْمَآءُ الْحُسْنٰی ط یُسَبِّحُ لَہٗ مَا فِی السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ ج وَھُوَ الْعَزِیْزُ الْحَکِیْمُ (۲۴)

یعنی یہ اللہ ہی ہے جو ہر چیز کے وجود کے تمام مراحل کو طے کراتا ہے۔ وہی ہر چیز کا خاکہ تیار کرتا ہے، وہی پھر اس کو وجود بخشتا ہے پھر وہی اس کی صورت گری کرتا اور نوک پلک سنوارتا ہے۔ ان میں سے کسی مرحلہ میں نہ وہ کسی سے طالبِ مدد ہوتا نہ کوئی اس کا ہاتھ بٹاتا یا بٹا سکتا ہے تو آخر کوئی دوسرا اس کا کسی چیز میں بھی شریک کس طرح بن جائے گا! ہر وجود کے اندر یہی تین اوّلین

مرحلے پیش آتے ہیں۔ پہلا مرحلہ اس کے ڈیزائن کا ہوتا ہے جس کے لیے عربی میں لفظ 'خلق' ہے۔ دوسرا مرحلہ اس کو وجود میں لانے کا ہے اس کے لیے لفظ 'بَرءٌ' ہے۔ تیسرا مرحلہ اس کی نوک پلک سنوارنے کا ہے اس کے لیے لفظ 'تصویر' ہے۔ اگر ہر شے کے یہ تینوں مرحلے اللہ طے کراتا ہے تو وہی ہر ایک کی تسبیح اور بندگی کا حق دار ہے۔

'لَهُ الْأَسْمَآءُ الْحُسْنٰى' یعنی یہ تو چند بنیادی صفات ہیں جو بیان ہوئی ہیں، ان کے علاوہ جتنی بھی اچھی صفتیں ہیں ان سب کا حقیقی موصوف وہی ہے۔ لفظ 'اسماء' یہاں صفات کے معنی میں ہے۔ اللہ تعالیٰ کے جتنے بھی نام ہیں وہ سب اس کی کسی نہ کسی صفت ہی کو تعبیر کرتے ہیں۔

'يُسَبِّحُ لَهُ مَا فِي السَّمٰوٰتِ وَالْأَرْضِ' چونکہ ہر چیز کے وجود کے تمام مراحل اللہ تعالیٰ ہی نے طے کرائے ہیں اس وجہ سے آسمانوں اور زمین کی ہر چیز اللہ ہی کی تسبیح کرتی ہے۔ انسان اگر اختیار سے بہرہ مند ہونے کے سبب سے اس سے اعراض کرتا ہے تو یہ اس کی حق ناشناسی اور سرکشی ہے۔ اس کے لیے بھی صحیح رویہ یہی ہے کہ وہ اپنے رب ہی کی تسبیح و بندگی کرے، کسی کو اس کا شریک نہ ٹھہرائے۔

'وَهُوَ الْعَزِيْزُ الْحَكِيْمُ' یہ آخر میں اپنی ان صفات کی پھر یاد دہانی کرا دی جن سے سورہ کا آغاز فرمایا تھا۔ مطلب یہ ہے کہ انسان کو یہ بات یاد رکھنی چاہیے کہ اللہ تعالیٰ عزیز ہے اس وجہ سے وہ جو چاہے کر سکتا ہے۔ اگر وہ چاہتا تو انسان بھی اسی طرح مجبورانہ اپنے رب کی بندگی اور تسبیح کرتا جس طرح ساری کائنات کر رہی ہے لیکن وہ حکیم بھی ہے اس وجہ سے اس نے یہ چاہا کہ وہ انسان کو اختیار دے کر آزمائے کہ وہ یہ شرف پاکر اپنے رب کا حق پہچانتا ہے یا شیطان کا مرید بن جاتا ہے۔

اللہ تعالیٰ کی توفیق سے ان سطور پر اس سورہ کی تفسیر تمام ہوئی۔ فَالْحَمْدُ لِلّٰهِ عَلٰى ذٰلِكَ۔

رحمان آباد
۳- فروری ۱۹۷۸ء
۲۳- صفر ۱۳۹۸ھ